www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

April 2010 • No. 401



دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی
طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف
اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدّین خاں

صدر اسلامی مرکز

اپریل 2010

فہرست

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24355454, 41827083,
24356666, 46521511
Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

عجز اور اختیار

قرآن کی سورہ نمبر 35 کی ایک آیت یہ ہے: **یا أیّها الناس أنتم الفقراء إلى الله، والله هو الغنی الحمید** (فاطر: 15) یعنی اے لوگو، تم سب اللہ کے محتاج ہو۔ اور اللہ بہت بے نیاز اور تعریف والا ہے۔ یہی بات ایک حدیث میں اِن الفاظ میں آئی ہے: **یا عبادی، کلّکم ضالّ، إلا مَن هدیتُه، فاستهدونی أهدِکم۔ یا عبادی، کلّکم جائع إلا من أطعمته، فاستطعمونی أطعمکم۔ یاعبادی، کلّکم عارٍ إلاّ من کسوته، فاستکسونی أکسُکم** (صحیح مسلم، کتاب البرّ، باب تحریم الظلم) یعنی اے میرے بندو، تم سب کے سب بھٹکے ہوئے ہو، سوا اُس کے جس کو میں راہ دکھاؤں۔ تم مجھ سے رہنمائی مانگو، میں تم کو رہنمائی دوں گا۔ اے میرے بندو، تم سب کے سب بھوکے ہو، سوا اس کے جس کو میں کھلاؤں۔ تم مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھانا دوں گا۔ اے میرے بندو، تم سب کے سب عاری ہو، سوا اُس کے جس کو میں پہناؤں۔ تم مجھ سے طلب کرو، میں تم کو پہناؤں گا۔

اللہ نے انسان کو ہر اعتبار سے ایک کامل وجود دیا، لیکن انسان کو کسی بھی اعتبار سے ذاتی اختیار حاصل نہیں۔ انسان مکمل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ اِس عجز کی تلافی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ موجودہ دنیا میں اِس عجز کی تلافی بقدرِ ضرورت کی گئی ہے، جس کا اشارہ قرآن کی اِس آیت میں موجود ہے: **وآتاکم من کلّ ما سألتموه** (ابراهیم: 34)۔ آخرت میں اہلِ جنت کے لیے اِس عجز کی تلافی بقدرِ خواہش کی جائے گی، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **ولکم فیها ما تشتهی أنفسکم** (حم السجدة: 31)۔

اِسی حقیقت کی دریافت سب سے بڑی معرفت ہے۔ قادرِ مطلق خدا کے مقابلے میں، اپنے عجزِ تام کو شعوری طور پر دریافت کرنا، یہی معرفت کا آغاز ہے۔ اِس دریافت کے بغیر کسی انسان کے اوپر معرفت کا دروازہ نہیں کھلتا — معرفت سے بہرہ مند لوگوں کے لیے جنت ہے، اور معرفت سے بے بہرہ لوگوں کے لیے جہنم۔

ایک انسانی کمزوری

عورت اورمرد دونوں میں یہ کمزوری بہت عام ہے کہ وہ مثبت تجربے کے وقت اعتراف کا کلمہ نہیں بولتے، لیکن اگر اُنھیں کوئی منفی تجربہ ہوتو وہ فوراً بے اعترافی کی بولی بولنے لگتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اِس کا جواب قرآن کی سورہ نمبر 89 سے معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی اِس کمزوری کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **فأمّا الإنسان إذا ما ابتلاہ ربّه فأکرمه ونعّمه فیقول ربّی أکرمن۔ وأمّا إذا ماابتلاہ فقدر علیه رزقه فیقول ربّی أھانن** (الفجر: 16-15) یعنی انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اُس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ انسان کو آزماتا ہے اور اُس کا رزق اس پر تنگ کردیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کردیا۔

اصل یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنے لیے استحقاق کا ایک درجہ مان لیتے ہیں۔ یہ درجہ ہمیشہ اپنے بارے میں برتر اندازہ (overestimation) پر قائم ہوتا ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب اُن کو دنیا کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا اِس لیے ہوا کہ میں اُس کا مستحق تھا، میرے ساتھ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔

اِس کے برعکس، جب وہ ایک نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں تو وہ اپنے مزاج کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک چیز جس کا میں مستحق تھا، وہ مجھ کو نہیں ملی۔ اِس طرح، دونوں حالتوں میں ان کا رویہ غلط ہوجاتا ہے۔ پانے کے موقع پر وہ بے اعترافی کا شکار ہوجاتے ہیں اور نہ پانے کے موقع پر وہ شکایت کرنے لگتے ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی چیز ملے تو اُس کے اندر شکر کی نفسیات پیدا ہو اور اس کا اظہار وہ اعتراف کے کلمات کے ساتھ کرے، اور جب اس کو محرومی کا تجربہ ہو تو وہ صبر کرے اور مزید اضافے کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے۔ یہی اِس معاملے میں ایک خدا پرست انسان کا طریقہ ہے۔

موت کی یاد

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں یہ آیت آئی ہے: **کلّ نفس ذائقة الموت (آل عمران: 185)** یعنی ہر انسان موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ موت کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: **أکثروا ذکرَ هاذم اللّذاتِ، الموت (الترمذی، النسائی، ابن ماجه، مشکاة المصابیح، رقم الحدیث: 1607)** یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے۔

اِس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ — موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو مبنی بر خواہش سوچ کو ڈھانے والی ہے، اور مبنی بر حقیقت سوچ کو پیدا کرنے والی ہے:

> Remember death much. It demolishes desire-based thinking, and produces reality-based thinking.

لذت (pleasure) کو وسیع معنی میں لیا جائے تو اِس میں انسان کی تمام سرگرمیاں شامل ہوجاتی ہیں۔ ہر کام جو آدمی کرتا ہے، وہ اِسی لیے کرتا ہے کہ اس میں کہیں نہ کہیں اس کو لذت مل رہی ہوتی ہے۔ معلوم مادی لذتوں کے علاوہ، وہ تمام چیزیں بھی اِس فہرست میں شامل ہیں جو بظاہر غیر مادی نظر آتی ہیں۔ مثلاً عزت، شہرت، اقتدار، اسٹیج، سماجی رتبہ، مقبولیت، عوامی استقبال، وغیرہ۔ غرض تمام مادی اور غیر مادی چیزیں اِس فہرستِ لذت میں شامل ہیں۔ اگر لذت نہ ملے تو آدمی کوئی کام نہیں کرے گا۔

اِس طرح موت کا احساس آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو اپنا ہدف نہیں بنا سکتا جو آج ملے اور کل کے دن وہ مکمل طور پر اُس سے چھن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کی حیثیت کسی عورت یا مرد کے لیے سب سے بڑے معلم (teacher) کی ہے۔ موت کا تصور آدمی کے اندر انقلاب پیدا کر دینے والا ہے۔

آخرت کا ائرپورٹ

ایک بار میں ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہوئے ایک ائر پورٹ پر اترا۔ میں اور دوسرے اکثر مسافر ضروری مراحل سے گزرتے ہوئے باہر آگئے، لیکن چند مسافر ایسے تھے جن کو ائر پورٹ پر روک لیا گیا۔ اُن سے کہا گیا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریے، آپ لوگوں کی خصوصی چیکنگ ہوگی۔ ان افراد کے بارے میں کوئی خفیہ اطلاع ملی تھی، جس کی وجہ سے ائر پورٹ کے عملہ نے اُن کے ساتھ ایسا کیا۔

ائر پورٹ پر یہ منظر دیکھ کر مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آئی۔ وہ آیت یہ تھی: **وقفوهم، إنهم مسئولون (الصّافات: 24)** یعنی ان لوگوں کو ٹھہراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

غور کیجئے تو زندگی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ انسان جس زمین پر آباد ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے۔ گویا کہ ہم ایک ایسے ہوائی جہاز پر سوار ہیں جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک ائر پورٹ کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ ائر پورٹ آخرت کا ائر پورٹ ہے۔ ایک وقت آئے گا، جب کہ تمام انسان آخرت کے ائر پورٹ پر اتار دئے جائیں گے۔ یہاں یہ واقعہ ہوگا کہ کچھ لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم یہاں ٹھہرو، تم سے ابھی پوچھ گچھ ہونے والی ہے۔ دوسری طرف، کچھ ایسے خوش نصیب لوگ ہوں گے جن کا استقبال فرشتے یہ کہہ کر کریں گے: **سلام عليكم، طبتم، فادخلوها خالدين (الزمر: 73)** یعنی تم پر سلامتی ہو، تم شادر ہو، پس ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یہ صورتِ حال سارے انسانوں کے ساتھ پیش آنے والی ہے۔ دنیا کے سفروں کا وقت مقرر رہتا ہے، لیکن آخرت کے اس سفر کا وقت مقرر نہیں۔ کسی بھی لمحہ انسان کے اوپر وہ وقت آسکتا ہے، جب کہ زندگی کا جہاز آخرت کے ائر پورٹ پر اتر جائے اور پھر وہاں کچھ لوگ پوچھ گچھ کے لیے روک لئے جائیں اور کچھ لوگوں کو فرشتے خوش آمدید کہتے ہوئے جنت میں داخل کردیں۔ بلاشبہہ یہی وہ سب سے بڑی بات ہے جس پر ہر عورت اور مرد کو سوچنا چاہئے، اور جس کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ آنے والا وقت اعلان کے بغیر کسی بھی وقت آجائے گا اور پھر کسی کے لیے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ لوٹ کر دوبارہ پیچھے کی طرف جاسکے۔

قرآن میں غور وفکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اِس لیے اتاری کہ اہلِ عقل اس کی آیتوں پر غور کریں اوراس سے نصیحت حاصل کریں (ص: 29) یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں گہری نصیحت موجود ہے،لیکن اِن نصیحتوں کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی آیتوں پر مسلسل غور کیا جائے۔

اِس معاملے کی ایک سادہ مثال یہ ہے کہ قرآن کی سورہ نمبر 2 میں بتایا گیا ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کے بعد جنت میں بسایا تھا،لیکن آدم نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اِس کے نتیجے میں وہ گنہ گار ہوگئے۔ اِس کے بعد قرآن میں یہ آیت آئی ہے: **فتلقّی آدم من ربه کلمات فتاب علیه، إنه هو التواب الرحیم** (البقرۃ: 37) یعنی پھر آدم نے اللہ سے کچھ کلمات حاصل کیے تو اللہ اُس پر متوجہ ہوا۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اگر آپ اِس آیت کو صرف تلاوت کے طور پر نہ پڑھیں، بلکہ اُس پر غور کریں تو آپ کے دل میں فوراً یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ کلماتِ دعا کیا تھے جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدم کو ملے۔ یہ کلماتِ دعا اتنے موثر تھے کہ اس کو ادا کرنے کے بعد آدم کا گناہ معاف ہوگیا اور وہ دوبارہ اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پائے۔

جب آپ اِس طرح غور کریں گے تو آپ پر کھلے گا کہ اِس الہامی دعاء کے کلمات اگر چہ یہاں مذکور نہیں ہیں،لیکن وہ قرآن میں دوسرے مقام پر بتا دیے گئے ہیں۔ یہ دوسرا حوالہ ہم کو قرآن کی سورہ نمبر 7 میں اِن الفاظ کے ساتھ ملتا ہے: **ربّنا ظلمنا أنفسنا، وإن لم تغفر لنا وترحمنا، لنکونن من الخاسرین** (الأعراف: 23)، یعنی آدم اور حوا نے دعا کرتے ہوئے کہا، اے ہمارے رب، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے—— قرآن کو غور وفکر کے ساتھ پڑھا جائے تو قرآن آدمی کے لیے دریافت کی کتاب بن جائے گا، اور بلاشبہہ دریافت سے بڑی کوئی چیز انسان کے لیے نہیں۔

دوانتظامات

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی عنایات کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ عنایتیں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں۔ اُن میں سے ایک کو قرآن میں احسنِ تقویم (التین: 4) کہا گیا ہے۔ اور دوسری عنایت کے لیے قرآن کی اِس آیت میں اشارہ ہے: وآتاکم من کلّ ما سألتموہ (إبراھیم: 34) یعنی خدا نے تم کو وہ سب کچھ دیا جو تم نے اُس سے مانگا۔

احسنِ تقویم کو دوسری جگہ صورتِ احسن (الزمر: 64) کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو نہایت موزوں جسم دیا گیا ہے۔ انسانی جسم بہت سے آرگن (organs) یا نظامات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً دیکھنے کا نظام، سننے کا نظام، سانس لینے کا نظام، بولنے کا نظام، ہضم کا نظام، گردشِ خون کا نظام، حرکت کا نظام، وغیرہ۔ انسان کی عمر جب بڑھتی ہے تو ایک ایک نظام معطّل ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ سارے نظام معطل ہوجاتے ہیں اور انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

دوسرا انتظام وہ ہے جو انسانی وجود کے باہر خارجی دنیا میں کیا گیا ہے۔ مثلاً روشنی اور حرارت کا نظام، ہوا کا نظام، آکسیجن کی سپلائی کا نظام، پانی اور بارش کا نظام، زراعت کا نظام، وغیرہ۔ یہ خارجی نظامات انسانی زندگی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ یہ نظامات اگر جزئی یا کلی طور پر معطل ہوجائیں تو انسانی زندگی کا خاتمہ ہوجائے۔

مذکورہ تقسیم میں دوسرے نظام کو لائف سپورٹ سسٹم (life support system) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح پہلے نظام کو آرگن سپورٹ سسٹم (organ support system) کہا جاسکتا ہے۔ اِنھیں دونوں انتظامات پر انسان کی زندگی قائم ہے۔

اِن دونوں انتظامات کو گہرائی کے ساتھ جاننا، آدمی کے لیے معرفت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں شکر کے اعلیٰ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اِس سے آدمی کے اندر تمام مثبت صفات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً تواضع، سنجیدگی، اعترافِ حق، وغیرہ۔

ربّانی دعاء

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آدم سے جب یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا تو اچانک وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہوگئے۔ اس کے بعد ان کو سخت ندامت ہوئی اور انھوں نے اللہ سے معافی کی دعاء کی۔ اِس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **فتلقّی آدم من ربّہ کلمات فتاب علیه، إنه هو التواب الرحیم (البقرۃ: 37)**۔

اِس آیت میں تلقّی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تلقّی کے لفظی معنی ہیں ملنا (to receive)، یعنی آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات اخذ کئے، پھر اس کے مطابق، دعاء کی تو اللہ نے ان کی دعاء کو قبول فرمایا۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اِس تلقّی کی صورت کیا تھی۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ نے آواز دے کر آدم کو بتایا، یا کوئی فرشتہ آیا اور اس نے انھیں اِن کلمات کی تلقین کی۔ یہاں اِس قسم کا مفہوم لینا درست نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ الہام (inspiration) کا ایک معاملہ تھا۔ اِسی طرح کے معاملے کی بابت امام مالک بن انس نے کہا ہے: **نورٌ یُلقیٰ فی قلب المؤمن**۔ یعنی یہ ایک روشنی ہے جو مومن کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ جب کسی بندے پر شدید انابت طاری ہوتی ہے، وہ گریہ وزاری کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، وہ آخری حدتک اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے، اُس وقت نفسیات کی سطح پر اس کے اوپر ربّانی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات کچھ خاص الفاظ میں ڈھل جاتی ہیں۔ اِسی کو ربانی دعا کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی ربانی دعاء اپنے آپ میں قبولیت کی پیشگی خبر ہوتی ہے۔

اِس قسم کی ربانی دعاء کی توفیق کس کو ملتی ہے۔ یہ توفیق اُس شخص کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو کامل عبدیت کے مقام پر پہنچائے، جو اِس حقیقت کو کامل سطح پر دریافت کرے کہ وہ پانے والا ہے اور خدا دینے والا۔ اِس قسم کا گہرا احساس جب آدمی کے اوپر طاری ہو تو وہ ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جب کہ بندے کا خصوصی تعلق اللہ سے قائم ہوجاتا ہے۔ اُس وقت اس کی زبان سے ذکر ودعاء کے الہامی الفاظ نکلنے لگتے ہیں۔ اِسی کا نام ربانی دعاء ہے۔

خیرِ امت

قرآن کی سورہ نمبر 3 کی ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: **کنتم خیر أمة أخرجت للناس، تأمرون بالمعروف، وتنهون عن المنكر، وتؤمنون بالله** (آل عمران: 110) یعنی تم بہترین گروہ ہو، جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

قرآن کی اِس آیت میں، خیر امت کا مطلب خیر الامم یا افضل الامم نہیں ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ دراصل امت کی مسئولیت (responsibility) کو بتاتے ہیں۔ اِس مسئولیت کی طرف اشارہ 'النّاس' کے لفظ میں پایا جاتا ہے، یعنی **لتکونوا شهداء على الناس** (البقرة: 143)۔ اِس آیت کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ خاتم النبیین کے بعد پیغمبرانہ رول کی ادائیگی کے لیے امت محمدی کا تقرر کیا گیا ہے۔ پیغمبر کا کام شہادت علی الناس تھا۔ اب شہادت علی الناس کا یہی کام امت محمدی کو قیامت تک انجام دیتے رہنا ہے (**ليكون الرسول شهيداً عليكم، وتكونوا شهداء على الناس**)۔

لیکن امتِ محمدی کسی جامد گروہ کا نام نہیں ہے۔ دوسرے انسانی گروہوں کی طرح، امت محمدی میں بھی موت وحیات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اِس طرح ایسا ہوتا ہے کہ ایک نسل اپنی عمر پوری کر کے ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی جگہ دوسری نسل آجاتی ہے۔ اِس طرح توالد وتناسل کے ذریعے یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ امت کی حیثیت حکماً تو ہمیشہ یکساں طور پر باقی رہتی ہے، لیکن امت کے افراد ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً صحابہ کے گروہ کے بعد تابعین کا گروہ، تابعین کے گروہ کے بعد تبع تابعین کا گروہ، اور تبع تابعین کے گروہ کے بعد ہر دور کے دوسرے مسلم گروہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہم عصر مسلم گروہ (صحابہ) کی تربیت براہ راست کی تھی۔ اِس پیغمبرانہ تربیت کو قرآن میں تزکیہ (البقرة: 129) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی تربیت کے ذریعے صحابہ خیر امت کی پہلی ٹیم بنے۔ اب سوال یہ ہے کہ بعد کی نسلوں کو دوبارہ خیر امت کا

مصداق بنانے کا طریقہ کیا ہوگا۔ یہی وہ بات ہے جس کو آیت کے اگلے حصے میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر** ۔اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد **تآمُر بالمعروف** اور **تناهي عن المنكر** ہے، یعنی اہلِ ایمان کا آپس میں ایک دوسرے کے اوپر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا۔ اِس سے مراد دراصل داخلی تربیت کا نظام ہے۔ دوسرے الفاظ میں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حیثیت اصلاحی تدابیر (corrective measures) کی ہے جو امت کو نسل درنسل مسلسل طور پر حالتِ خیر پر باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔

'**خير أمّة**' سے مراد امت کی نمائندہ حیثیت ہے۔ '**للناس**' کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ اِس امت کا خارجی نشانہ شہادت علی الناس ہے۔ '**تأمرون بالمعروف، وتنهون عن المنكر**' کے الفاظ میں، داخلی تربیت کے نظام کو بتایا گیا ہے۔ '**تؤمنون بالله**' سے مراد امت کے افراد میں زندہ ایمان کو مسلسل طور پر باقی رکھنا ہے۔ یہی نظام امت کو، خیر امت کی حالت پر باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔ امت کے اندر اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام باقی نہ رہے تو اللہ کے نزدیک امت کی حیثیت العیاذ باللہ، ملعون امت کی بن جائے گی، نہ کہ خیر امت کی۔ یہ انتباہ خود قرآن اور حدیث میں واضح طور پر دیا گیا ہے۔

اِس معاملے کی سنگینی ایک حدیثِ رسول سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ الترمذی کے الفاظ یہ ہیں: **لما وقعتْ بنو إسرائيل في المعاصي نهتهم علمائهم فلم ينتهوا، فجالسوهم في مجالسهم، وآكلوهم وشاربوهم، فضرب الله قلوبَ بعضهم ببعض، فلعنهم على لسان داؤد وعيسى ابن مريم ذلك بما عصوا وكانوا يعتدون. قال: فجلس رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان متكئاً، فقال: لا، والذى نفسى بيده حتى تأطروهم أطْراً (كتاب التفسير)** یعنی جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے، اُن کے علماء نے ان کو روکا، مگر وہ نہیں رکے۔ پھر علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھے۔ انھوں نے ان کے ساتھ کھایا اور ان کے ساتھ پیا، پھر اللہ نے لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے متاثر کردیا۔ چناں چہ اللہ نے داؤد اور عیسی بن مریم کی زبان سے اُن پر لعنت کی۔

یہی بات قرآن کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے (**ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون۔ المائدة: 78**)۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے پھر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا: اُس ذات کی قسم، جس کے قبضے میں میری جان ہے (لعنت کی حالت باقی رہے گی) یہاں تک کہ تم ان کو پوری کوشش سے روک دو۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: **كلاّ، والله لتأمرنّ بالمعروف ولتنهونّ عن المنكر، ولتأخذنّ على يدى الظالم، ولتأطرنّه على الحق أطْراً، ولتقصرنّه على الحق قصْراً، أو ليضربنّ الله بقلوب بعضكم على بعض، ثمّ ليلعننّكم كما لعنهم (أبو داؤد، كتاب الملاحم)** یعنی ہرگز نہیں، تم کو ضرور (آپس میں) معروف کا حکم دینا ہوگا اور تم کو ضرور (آپس میں) منکر سے روکنا ہوگا، تم کو ضرور (آپس میں) ظالم کے ہاتھ کو پکڑنا ہوگا، تم کو ضرور اُسے حق کی طرف موڑنا ہوگا، تم کو ضرور اُس کو حق کی طرف لوٹانا ہوگا، ورنہ اللہ ضرور تمھارے دلوں کو ایک دوسرے سے متاثر کر دے گا، پھر تم پر وہ اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اُس نے اِس سے پہلے یہود پر لعنت کی۔

لعنت کوئی پراسرار لفظ نہیں۔ لعنت سے مراد ہے — امت کے خیر کی حیثیت کا چھن جانا، یعنی جب تک امت کے افراد، خاص طور پر اس کے علماء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عمل کو واقعی طور پر زندہ رکھیں گے، اُس وقت تک امت خیر پر باقی رہے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل حقیقی طور پر جاری نہ رہے تو اُس وقت امت کے خیر کی حیثیت لازماً چھن جائے گی۔ اور خیر کی حیثیت کے چھن جانے ہی کا دوسرا نام لعنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد صرف کچھ جزئی چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً کسی مسلمان کا پاجامہ ٹخنے سے نیچا ہو تو آپ کہیں کہ اپنا پاجامہ ٹخنے سے اوپر کرو، کسی مسلمان کی داڑھی چھوٹی ہو تو آپ کہیں کہ اپنی داڑھی بڑھاؤ، کسی مسلمان کے سر پر ٹوپی نہ ہو تو آپ کہیں کہ اپنے سر پر ٹوپی رکھو، وغیرہ۔ اِس قسم کی باتیں شریعت سے زیادہ مسلم کلچر کا حصہ ہیں، اور مسلم کلچر کا تحفظ اپنی حیثیت کے اعتبار سے، صرف ایک قومی کام ہے۔ اِس قسم کی باتوں سے ہرگز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، ایک اصولی کام ہے۔ اس کا تعلق شریعت کے اصولی معاملات سے ہے۔ جزئی معاملات یا کلچرل شناخت کے معاملات میں امر ونہی کرنے سے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر پچھلے کئی سو سال کے دوران جو اسلامی لٹریچر تیار ہوا، اس میں دعوت الی اللہ کو حذف کردیا گیا، اور علماء اِس غلطی کی تصحیح کے لیے نہیں اٹھے۔ پچھلے تقریباً دوسو سال سے علماء، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، مسلح جہاد میں مشغول ہیں، اور علماء کی کسی جماعت نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ مسلح جہاد حکومت کا کام ہے، نہ کہ علماء کا کام۔ مسلم ملکوں میں مختلف جماعتیں اپنے ملک کی حکومتوں کے خلاف ''خروج'' کی تحریکیں چلا رہی ہیں، لیکن علماء کی کسی جماعت نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف خروج کرنا حرام ہے۔

موجودہ زمانے میں ساری دنیا کے مسلمان غیر مسلم قوموں کے خلاف نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہیں، مگر علماء کی کسی جماعت نے کھلے طور پر یہ اعلان نہیں کیا کہ غیر مسلم قومیں ہمارے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں، اور مدعو سے نفرت کرنا جائز نہیں۔ بعد کی صدیوں میں کچھ لوگوں نے غیر مسلم علاقوں کے بارے میں مبتدعانہ طور پر یہ اعلان کیا کہ وہ دار الکفر یا دار الحرب ہیں، لیکن علماء کی کسی جماعت نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اِس تصور کو کھلے طور پر غلط بتائیں اور یہ کہیں کہ ساری دنیا دار الانسان یا دار الدعوہ ہے، کوئی بھی علاقہ نہ دار الکفر ہے اور نہ دار الحرب۔

نہی عن المنکر یا تناہی عن المنکر کوئی پُراسرار لفظ نہیں۔ یہ عین اُسی چیز کا نام ہے جس کو عام زبان میں، نقد یا تنقید (criticism) کہا جاتا ہے۔ اِسی صفت کو حدیث میں **المؤمن مرآۃ المؤمن (أبو داؤد، کتاب الأدب)** کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئینہ کسی تحفظ (reservation) کے بغیر بے کم وکاست آپ کے چہرے کو دکھا دیتا ہے۔ اِسی طرح مومن کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے مومن کے بارے میں کھلے طور پر اظہارِ خیال کرے۔ وہ کھلے طور پر اپنی نصیحت دوسرے کو پہنچا دے۔ ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب کہ مسلم معاشرے میں تنقید کو برا نہ مانا جائے، بلکہ تنقید کو کھلے دل کے ساتھ قبول کیا جائے۔

کسی مسلم معاشرے میں اگر کھلی تنقید کا ماحول نہ ہو تو یہ ایک سنگین خطرے کی علامت ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ دین کے بارے میں بے حسی کا شکار ہو چکے ہیں۔ سنانے والے مفاد پرستی میں مبتلا ہیں، اور سننے والے خود پرستی میں جی رہے ہیں۔ کسی معاشرے میں نہی عن المنکر یا تناہی عن المنکر کے ماحول کا ختم ہوجانا اِس بات کی علامت ہے کہ وہ معاشرہ ایسے افراد سے خالی ہوگیا ہے جو خدا کے لیے تڑپے، جو خدا کے دین کی پامالی پر بے قرار ہو۔ مزید یہ کہ معاشرہ ایسے افراد سے بھی خالی ہوگیا ہے جو تنقید سننے کے بعد یہ کہہ سکیں کہ: میں غلطی پر تھا۔ ایسا معاشرہ دینی اعتبار سے، ایک مردہ معاشرہ ہے۔ ایسا معاشرہ گویا کہ زندوں کی بستی نہیں، بلکہ وہ مردوں کا قبرستان ہے۔ جب کوئی معاشرہ اِس حالت تک پہنچ جائے تو اس کے اوپر سے خدا کی نصرت اٹھ جاتی ہے۔ خدا کی نصرت سے اِسی محرومی کو قرآن اور حدیث میں لعنت کہا گیا ہے۔

’تؤمنون باللہ‘ —— اللہ پر زندہ ایمان رکھنا، اللہ پر زندہ یقین کا مسلسل طور پر ذہن میں باقی رہنا، یہی ایمان باللہ ہے۔ اور اِس قسم کا ایمان باللہ ہی اِس بات کی ضمانت ہے کہ امت اپنی مطلوب حالت پر مسلسل باقی رہے۔ زندہ ایمان ہوگا تو امت کے اندر مسئولیت کا احساس تازہ رہے گا۔ زندہ ایمان ہوگا تو امت شہادت علی الناس کے فرض کی ادائیگی میں مسلسل طور پر سرگرم رہے گی۔ زندہ ایمان ہوگا تو امت کے افراد ایک دوسرے پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ مطلوب انداز میں انجام دیتے رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر زندہ ایمان تمام فرائض کی حسنِ ادائیگی کی یقینی ضمانت ہے۔

قرآن میں اللہ کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ: کل یوم ہو فی شأن (الرحمن: 29) یعنی اللہ ہر لمحہ ایک نئی شان کے ساتھ ہے۔ یہ اللہ کی صفت ہے۔ یہی صفت انسان کے اندر عبدیت کی سطح پر ہونا چاہیے۔ اللہ پر ایمان وہ ہے جو تخلیقی ایمان ہو، جو ہر لمحہ ایک نئی ذہنی سرگرمی کے ہم معنیٰ بن جائے۔ ایسا ایمان ہی کسی آدمی کو مسلسل طور پر زندہ یقین عطا کرسکتا ہے۔ ایسے ایمان والے لوگ ہی اُس ذمے داری کو حقیقی طور پر انجام دے سکتے ہیں جو خیر امت سے مطلوب ہے۔

کتمانِ حق

قرآن کی سورہ نمبر 3 میں بتایا گیا ہے کہ یہود سے اللہ تعالی نے عہد (میثاق) لیا۔ اِس عہد میں اُن کو یہ تاکیدی حکم دیا گیا تھا کہ: لتبیننه للناس ولا تکتمونه (آل عمران: 187) یعنی تم خدائی ہدایت کو ضرور لوگوں کے سامنے پوری طرح کھول کر بیان کروگے اور اُس کو لوگوں سے ہرگز نہ چھپاؤگے۔

اِس آیت میں یہود کے بارے میں جس حکم کا ذکر کیا گیا ہے، وہ خود یہود کی اصلاح کا حکم نہیں ہے، اس سے مراد غیر یہود کو وہ ہدایت پہنچانا ہے جو یہود کو اُن کے پیغمبروں کے ذریعے دی گئی تھی۔ یہ عین وہی حکم تھا جس کو امتِ محمدی کی نسبت سے، شہادت علی الناس (البقرة: 143) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِسی ذمے داری کی بنا پر یہود کو وہ خصوصی حیثیت دی گئی جس کو منتخب گروہ (chosen people) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اِس تقرری کے عہد کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ مثلاً بائبل کی کتاب یسعیاہ میں یہود کے بارے میں ہے کہ — تم میرے گواہ ہو: You are My witness (Isaiah 43: 10)۔ جیوش انسائکلو پیڈیا میں اِس حقیقت کو حسب ذیل الفاظ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے: بنی اسرائیل کو خصوصی طور پر یہ ذمے داری تفویض کی گئی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے خدا کی توحید کا اعلان کریں:

Upon Israel specially devolved the duty of proclaiming God's unity

شہادت علی الناس کی یہی ذمے داری اب امتِ محمدی کے اوپر ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کتمان سے مراد کتاب کو یہود سے چھپانا نہیں ہے، بلکہ اس کو غیر یہود سے چھپانا ہے۔ یہی معاملہ امتِ محمدی کا ہے۔ امت محمدی اگر ایسا کرے کہ وہ خود قرآن کو پڑھے اور پڑھائے، لیکن وہ قرآن کو غیر مسلموں تک نہ پہنچائے تو یہ اس کے لیے قرآن کے کتمان کے ہم معنی ہوگا۔ اِس قسم کا کتمان جس طرح یہود کے لیے خدا کے نزدیک اپنی اصل حیثیت کو کھونے کے ہم معنی تھا، اِسی طرح یہ کتمان امتِ محمدی کے لیے بھی اس کی اصل حیثیت کو کھونے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔

موت کا سبق

17 جنوری 2010 کو جیوتی باسو (Jyoti Basu) کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 96 سال تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بڑے لیڈروں میں سے تھے۔ وہ مسلسل 23 سال تک ویسٹ بنگال کے چیف منسٹر رہے۔ ان کی وفات کا سبب ڈاکٹروں نے جسم کے کئی اعضا کا فیل ہوجانا (multi organ failure) بتایا ہے۔

انسان کو اِس دنیا میں جو جسم ملا ہے، وہ ایک مکمل نوعیت کا زندہ کارخانہ ہے۔ اِس میں بیک وقت بہت سے نظام کام کررہے ہیں— سوچنے کا نظام، دیکھنے کا نظام، سننے کا نظام، ہضم کا نظام، حرکتِ قلب کا نظام، سانس لینے کا نظام، اعضاء کو متحرک کرنے کا نظام، وغیرہ۔

یہ تمام نظام نہایت متوافق طور پر عمل کرتے ہیں تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی انسان ایک زندہ وجود کے طور پر دنیا میں اپنا کام کرے۔

مثلاً نظامِ حافظہ اگر کام نہ کرے تو آدمی کو کوئی بات یاد نہیں رہتی، نظامِ بصارت کام نہ کرے تو آدمی اندھا ہوجاتا ہے، نظامِ سماعت کام نہ کرے تو آدمی کو کچھ سنائی نہیں دیتا، نظامِ نطق کام نہ کرے تو آدمی گونگا ہوجاتا ہے، نظام ہضم کام نہ کرے تو آدمی کی صحت خراب ہوجاتی ہے، نظامِ حرکت کام نہ کرے تو آدمی اپاہج بن جاتا ہے۔ نظامِ تنفس کام نہ کرے تو آدمی کے لیے سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور اگر نظامِ قلب کام نہ کرے تو آدمی کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہوجاتا ہے، وغیرہ۔

موت اِس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسان کے وجود کے مختلف نظام کسی اور کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔ وہ جب تک چاہے، انسان کو زندہ رکھے اور جب چاہے، انسان پر موت طاری کردے۔ ہر روز دنیا میں موت کے تقریباً ایک لاکھ واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو یہ سب سے بڑی خبر سنا رہے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی سب سے بڑی خبر ہے جس کا شعوری علم کسی زندہ انسان کو نہیں۔

معرفتِ اعلیٰ کی مثال

عبداللہ بن ابی مُلیکہ کہتے ہیں کہ اُن سے بیان کیا ذکوان نے جو کہ حضرت عائشہ کے دربان تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس آئے اور انھوں نے حضرت عائشہ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ میں حضرت عائشہ کے پاس گیا۔ اُس وقت ان کے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمٰن ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ عبداللہ بن عباس آئے ہیں اور وہ آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ان کے بھتیجے ان کی طرف جھکے اور کہا کہ یہ عبداللہ بن عباس ہیں۔ حضرت عائشہ اُس وقت موت کے قریب تھیں۔ انھوں نے کہا کہ چھوڑو ابن عباس کو۔ انھوں نے کہا کہ اے میری ماں، ابن عباس آپ کی اولاد کے صالحین میں سے ہیں۔ وہ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور آپ سے ملنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو ان کو اجازت دے دو۔ پھر میں نے عبداللہ بن عباس کو اندر داخل کیا۔ وہ بیٹھے اور کہا: آپ کو بشارت ہو، کیوں کہ آپ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب سے ملاقات میں اب اتنی ہی دوری ہے کہ روح آپ کے جسم سے نکل جائے۔ آپ، رسول اللہ صلی اللہ کی ازواج میں سب سے زیادہ محبوب تھیں اور رسول اللہ صرف پاک روح سے محبت کر سکتے تھے۔ ابواء کی رات میں آپ کا ہار گر گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے رات کو روانہ ہوئے، یہاں تک کہ منزل پر صبح کی۔ اُس وقت لوگوں کے پاس پانی نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت (**المائدة: 6**) اتاری۔ یہ آپ کے سبب سے ہوا۔ اِس طرح امت کے لیے رخصت کا حکم اترا۔ اور آپ کے لیے ساتویں آسمان سے برأت لے کر جبریل امین اترے۔ چناں چہ ہر مسجد میں صبح وشام آپ کا ذکر ہونے لگا اور وہ آیتیں پڑھی جانے لگیں۔ اِس کو سن کر حضرت عائشہ نے کہا: **دعْني منك يا ابن عباس، فوا الذى نفسى بيده، لوددتُ أنّي كنت نسياً منسيًّا** (اے ابن عباس، مجھ کو چھوڑو۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میں بھولی بسری بن جاؤں (**الطبقات الكبرى لابن سعد**، جلد 8، صفحہ 51، بحوالہ: کتاب احکام النساء لعبد الرحمٰن بن علی الجوزی، صفحہ 431، الطبعۃ الثانیۃ، 1993، وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ، قطر)

دل ایک معجزہ

انسان کے جسم میں بہت سے آرگن (organ) ہیں۔ اِن تمام آرگن کے درست طور پر چلنے سے انسان زندہ رہتا ہے، اور جب یہ آرگن کام نہ کریں تو انسان مرجاتا ہے۔ اِنھیں میں سے ایک آرگن وہ ہے جس کو دل (heart) کہا جاتا ہے۔ دل ایک عجیب آرگن ہے جو گردشِ خون کے نظام کو جسم کے اندر جاری رکھتا ہے:

Organ that serves as a pump to circulate the blood.

دل ایک بے حد پیچیدہ نظام ہے۔ وہ رُکے بغیر مسلسل حرکت کرتا ہے۔ اِس حرکت کی رفتار عمر کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ ایک بالغ آدمی کے دل کی حرکت اوسطاً 80 بار فی منٹ ہوتی ہے:

The average adult rate is 80 per minute.

دل کی یہ مسلسل حرکت فطری نظام کے تحت آٹو میٹک طور پر رات دن جاری رہتی ہے۔ اگر ایسا ہو کہ آدمی کو خود اپنے ہاتھ سے اس کو پمپ کرنا پڑے تو زندگی ناممکن ہوجائے۔ اِس کے بعد آدمی کے لیے کسی اور کام کا وقت ہی نہیں رہے گا، حتی کہ وہ رات کے وقت سو بھی نہیں سکے گا، کیوں کہ زندگی کو باقی رکھنے کے لیے رات کے وقت بھی پمپ کرنے کے اِس کام کو جاری رکھنا ہے۔

اس طرح ان گنت فطری نظام ہیں جو انسانی جسم کے اندر اور انسانی جسم کے باہر مسلسل کام کرتے ہیں، اس کے بعد ہی اِس زمین پر انسان جیسی مخلوق کا وجود ممکن ہوتا ہے۔ یہ انتظامات اتنے زیادہ ہیں کہ آدمی اُن کو گن بھی نہیں سکتا۔

اگر آدمی گہرائی کے ساتھ سوچے تو ہر وقت وہ شکر کے احساس میں جینے لگے۔ وہ کامل طور پر غرور اور سرکشی کی نفسیات سے خالی ہوجائے۔ وہ مکمل طور پر ایک متواضع (modest) انسان بن جائے۔ وہ بے اعترافی جیسی چیزوں کا تحمل نہ کرسکے۔ یہی معرفت ہے۔ اسی معرفت کا شعور انسان کو وہ مطلوب انسان بناتا ہے جس کو قرآن میں ربانی انسان کہا گیا ہے۔

موت کا زندہ تصور

31 جنوری 2010 کو میرے چھوٹے بھائی عبدالمحیط خاں (انجینئر) کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت وہ فیض آباد میں تھے۔ ان کی عمر تقریباً 75 سال تھی۔ میں نے اپنی لمبی عمر میں ہزاروں افراد کو مرتے ہوئے دیکھا ہے یا ان کی موت کی خبر سنی ہے۔ لیکن میرے بھائی کی موت میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس نے میرے اندر ایک نیا تصور پیدا کیا۔ اس کو اگر میں کوئی نام دوں تو میں کہوں گا کہ موت کا زندہ تصور (living concept of death)۔

میں نے غور کیا کہ موت کے بارے میں یہ نیا شعور میرے اندر کیوں پیدا ہوا۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ 6 بھائی بہن تھے۔ چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میرے سوا تمام بھائی بہن مر چکے ہیں۔ اِس اعتبار سے، اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ اِس احساس سے مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ میرے بھائی اور بہن کل تک اِسی دنیا میں تھے جہاں کہ میں ہوں، لیکن اب وہ ایک ایک کرکے مر چکے ہیں، یہاں تک کہ 6 بہن بھائیوں میں اب میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ لوگ اِس دنیا سے نکل کر ایک اور دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ اب نہ وہ مجھ سے مل سکتے ہیں اور نہ میں اُن سے مل سکتا۔ موت نے مجھ کو اپنے تمام بھائی بہنوں سے ابدی طور پر جدا کردیا۔

موت کیا ہے۔ موت ایک جبری انخلا (compulsory expulsion) کا معاملہ ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر آدمی اپنے لیے ایک دنیا بناتا ہے — گھر، جائداد، بزنس، اولاد، تعلقات، شہرت، عوامی حلقہ، عہدہ، سماجی پوزیشن، وغیرہ۔ اِن تمام چیزوں کی بنیاد پر ہر آدمی کی اپنی ایک چھوٹی یا بڑی دنیا ہوتی ہے، جس کے اندر وہ اپنے صبح وشام گزارتا ہے۔ وہ اس کو اپنی دنیا سمجھتا ہے۔ لیکن اچانک موت کا وقت آجاتا ہے اور فرشتے اس کو جبری طور پر موجودہ دنیا سے نکال کر اُس دنیا میں پہنچا دیتے ہیں، جہاں اس کے پاس اپنے ذاتی وجود کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا — موت کے واقعے کو صرف وہ شخص جانتا ہے جو اِس حقیقت کا زندہ شعور رکھتا ہو۔

ذہنی افق

ذہنی افق (intellectual horizon) کے کئی درجے یا کئی سطحیں ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاملہ افق بالائے افق کا معاملہ ہے۔ اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک صرف وہ افراد کر سکتے ہیں جو اعلیٰ ذہنی افق کے مالک ہوں۔ کم تر ذہنی افق کے لوگ اعلیٰ حقیقتوں سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ یہی معاملہ ایمان کا ہے۔

اِس سلسلے میں کچھ صحابہ کی مثال قابلِ ذکر ہے جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ مثلاً عمر بن الخطاب (وفات: 23ھ)، معاذ بن جبل (وفات: 18ھ)، عبد اللہ بن رواحہ الانصاری (وفات: 8ھ)۔ اِن حضرات کا طریقہ تھا کہ وہ بعض صحابہ کے ساتھ بیٹھ کر اللہ کا چرچا کرتے اور کہتے کہ ایسا ہم اضافۂ ایمان کے لیے کر رہے ہیں۔ ایک بار عبد اللہ بن رواحہ نے ایک صحابی سے کہا کہ آؤ ہم ایک ساعت کے لیے ایمان لائیں۔ وہ صحابی غصہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم مؤمن نہیں ہیں، پھر وہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ عبد اللہ بن رواحہ آپ پر ایمان کے بعد ایک ساعت کا ایمان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ ابن رواحہ پر رحم کرے، وہ ایسی مجلسوں کو پسند کرتے ہیں جن پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں **(رحم اللہ ابن رواحة، إنه یحب المجالس التی تتباھیٰ بھا الملائکة) حیاة الصحابة، باب إیمان الصحابه بالغیب، مجالس الإیمان، جلد 3، صفحہ 13۔**

ایمان باللہ کا ابتدائی درجہ وہ ہے جو کلمۂ شہادت ادا کرنے کے بعد کسی آدمی کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایمان باللہ ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ چناں چہ قرآن میں ایمان کو پودے سے تشبیہہ دی گئی ہے جو مسلسل بڑھتا رہتا ہے (**إبراھیم**: 25-24)۔ ایک مومن جب اللہ کے بارے میں سوچتا ہے، جب وہ اِس موضوع کا مطالعہ کرتا ہے، جب وہ اِس پہلو سے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اِس عمل کے دوران اللہ پر اُس کا یقین بڑھتا رہتا ہے، وہ اللہ کی اعلیٰ صفات کی بار بار دریافت کرتا رہتا ہے، اُس کو بار بار یقین وایمان کی نئی خوراک ملتی رہتی ہے۔ یہ وہ اہلِ ایمان ہیں جو اعلیٰ ذہنی افق پر ایمان باللہ کا تجربہ کرتے ہیں۔

گرہن ایک خدائی معجزہ

گرہن (eclipse) ایک فلکیاتی ظاہرہ ہے۔ اکلپس (eclipse) کا لفظ قدیم یونانی زبان کے لفظ (ékleipsis) سے ماخوذ ہے۔ خلا میں گرہن کے مختلف واقعات ہوتے رہتے ہیں، لیکن معروف طور پر دو قسم کے گرہن کو گرہن کہا جاتا ہے۔ ایک سورج گرہن (Solar eclipse) اور دوسرا چاند گرہن (Lunar eclipse) ۔ عام طور پر سورج گرہن سال میں دو بار یا تین بار ہوتا ہے اور چاند گرہن سال میں دو بار واقع ہوتا ہے۔ چاند گرہن چند گھنٹوں تک رہتا ہے، جب کہ کامل سورج گرہن کچھ منٹ تک رہتا ہے:

A lunar elicpse lasts for a few hours, whereas a total solar eclipse lasts for only a few minutes at any given place.

گرہن کا یہ واقعہ محکم فلکیاتی قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت پہلے ان کی قطعی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر 2010 میں 15 جنوری کو سورج گرہن ہوا۔ علماءِ فلکیات کی پیشگی خبر کے مطابق، پہلے سے لوگوں کو اِس گرہن کا علم تھا۔

گرہن کیا ہے۔ گرہن دراصل سایہ پڑ جانے کا دوسرا نام ہے۔ گردش کے دوران جب چاند، زمین اور سورج کے درمیان آجائے تو سورج اس آڑ کی بنا پر جزئی یا کلّی طور پر دکھائی نہیں دے گا۔ اِسی کا نام سورج گرہن ہے۔ اور جب زمین، چاند اور سورج کے درمیان آجائے تو چاند پر جزئی یا کلی طور پر زمین کا سایہ پڑ جائے گا۔ اِسی کا نام چاند گرہن ہے:

Eclipse: In astronomy, partial or complete obscuring of one celestial body by another as viewed from a fixed point. Solar eclipses occur when shadow of Moon falls on Earth, which happens two or three times per year. Lunar eclipses occur when shadow of Earth falls on Moon; at most two seen per year.

قدیم زمانے میں گرہن کے بارے میں عجیب قسم کے توہماتی عقائد قائم تھے۔ مثلاً کچھ

لوگ یہ سمجھتے تھے کہ آسمان میں ایک بہت بڑا اژدہا ہے، وہ کبھی غصہ ہوکر چاند کونگل لیتا ہے، اس وقت چاند گرہن پڑتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین پر جب کسی بادشاہ یا کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے سورج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اسی کا نام سورج گرہن ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کے توہماتی تصورات ہزاروں سال تک قوموں میں رائج تھے، یہاں تک کہ دور بین (telescope) ایجاد ہوئی۔ گلیلیو نے پہلی بار 1609 میں دور بین کے ذریعہ سیاراتی نظام (planetary system) کا مشاہدہ کیا۔ اس کے بعد دور بین کو ترقی ہوئی اور مزید مشاہدات کئے گئے۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کا تعلق مذکورہ قسم کے توہماتی تصورات سے نہیں ہے، یہ تمام تر ایک فلکیاتی مظہر ہے۔ وہ صرف اس لئے واقع ہوتا ہے کہ گردش کے دوران دو خلائی اجسام (celestial bodies) کے درمیان تیسرا جسم آجاتا ہے۔ اس کی بنا پر وہاں ایک آڑ قائم ہوجاتی ہے۔ اسی آڑ کی بنا پر پیش آنے والے واقعہ کا نام گرہن ہے۔

قدیم زمانے میں گرہن صرف ایک توہماتی (superstitious) واقعہ بنا ہوا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں سائنسی مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ سادہ نوعیت کا ایک خلائی واقعہ ہے۔ اس واقعہ میں کوئی پُراسراریت شامل نہیں۔ گرہن کے موضوع پر موجودہ زمانے میں کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

Eclipses of the Sun and Moon (1937) by Sir F.W. Dyson
Eclipse Phenomena in Astronomy (1969) by F. Link
Eclipses in the Second Millennium BC (1954) by G. Van Bergh

گرہن کی تاریخ کا پہلا دور وہ ہے جب کہ اس معاملے میں توہماتی عقائد کا رواج تھا۔ گرہن کا دوسرا دور موجودہ زمانے میں دور بین کی ایجاد (1608) کے بعد شروع ہوا۔ گرہن کی تاریخ کا تیسرا دور وہ ہے جو اسلام کے ذریعہ انسان کے علم میں آیا، وہ یہ کہ گرہن کا تعلق نہ توہمات سے ہے اور نہ وہ صرف ایک مادی نوعیت کا فلکیاتی واقعہ ہے، بلکہ وہ خالقِ کائنات کے باشعور تخلیقی نظام کا ایک حصہ ہے۔

وہ خدا کی قدرتِ کاملہ کا ایک مظہر ہے، وہ انسان کے لیے خداوندِ عالم کا ایک تعارف ہے، گرہن خاموش زبان میں خدا کی حکیمانہ تخلیق کا اعلان کر رہا ہے۔

ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں شوال 10 ہجری (632ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن پڑا۔ قدیم توہماتی رواج کے مطابق، مدینہ کے کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ سورج گرہن پیغمبر کے بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی۔ آپ نے فرمایا: **إنّ الشمس والقمر لا یخسفان لموت أحد من الناس، ولٰکنهما آیتان من آیات الله، فإذا رأیتموها فصلّوا (صحیح البخاری، کتاب الکسوف)** یعنی سورج اور چاند میں کسی انسان کی موت سے گرہن نہیں لگتا، وہ اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہے۔ جب تم ایسا دیکھو تو نماز پڑھو۔

''چاند گرہن اور سورج گرہن خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں''— یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل اس معاملے کے اصل معنوی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند گرہن اور سورج گرہن جس طرح ہوتا ہے، اس پر غور کیا جائے تو وہ آدمی کے لئے خدا کی دریافت کا ذریعہ بن جائے گا۔ وہ سادہ طور پر فلکیاتی نشانی کے بجائے، زیادہ گہرے معنوں میں خدائی نشانی ثابت ہوگا۔

چاند گرہن یا سورج گرہن ایک انوکھا تخلیقی معجزہ ہے، اس کے پیچھے خالقِ کائنات کی معجزانہ صنّاعی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، گرہن اُس وقت پیش آتا ہے جب کہ تین خلائی اجسام، زمین، چاند، سورج، گردش کرتے ہوئے ایک سیدھ میں آجائیں۔ تینوں کے سائز میں بہت زیادہ فرق ہے۔ چاند کو اگر سرسوں کے دانے کے برابر سمجھا جائے تو اس کے مقابلے میں زمین فٹ بال کے برابر ہوگی اور سورج ہمالیہ پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہوگا۔

یہ تین مختلف سائز کے اجسام حرکت کرتے ہوئے ایسے تناسب سے ایک سیدھ میں آجاتے ہیں کہ زمین سے دیکھنے والا ان کو یکساں سائز میں دیکھنے لگے۔ جب تینوں کے درمیان چاند ہو تو سورج

گرہن واقع ہوگا۔ اور جب ان کے درمیان زمین ہوتو چاند گرہن واقع ہوگا۔ یہ وسیع خلا میں ایک انتہائی انوکھی پوزیشننگ کا معاملہ ہے:

> It is a unique well- calculated positioning of three moving bodies, highly inequal in size, in the vast space.

گرہن (eclipse) اُس وقت واقع ہوتا ہے جب کہ وسیع خلا کے تین اَجرام، زمین، چاند، سورج، انتہائی متناسب دوری کے ساتھ بالکل ایک سیدھ میں آجائیں۔ یہ ایک انتہائی حیرت ناک ظاہرہ ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ — ایک انتہائی غیر معمولی توافق کی بنا پر سورج اور چاند کا سائز اور دوری ایسے ہوجاتے ہیں کہ زمین سے بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا کہ دونوں بالکل برابر ہوں:

> By a remarkable coincidence, the sizes and distances of the Sun and Moon are such that they appear as very nearly the same angular size as the earth. (EPB 6/189)

گرہن کے اِس عجیب واقعے کو مقالہ نگار نے محض اتفاق (coincidence) قرار دیا ہے۔ مگر یہ بالکل غیر منطقی بات ہے۔ اِس قسم کا نادر اتفاق اولاً تو ممکن نہیں اور بالفرض اگر ایسا ہوجائے تو وہ بمشکل ایک بار ہوسکتا ہے، لیکن فلکیاتی تاریخ بتاتی ہے کہ گرہن کا یہ واقعہ لاکھوں برس سے اِسی طرح پابندی (regularity) کے ساتھ ہر سال پیش آرہا ہے۔ اِس قسم کی کامل باضابطگی ہرگز اتفاقاً نہیں ہوسکتی۔ یقینی طور پر وہ ایک قادرِ مطلق ہستی کی مسلسل کارفرمائی کے باعث ہی ممکن ہے۔ اتفاق کا لفظ اِس حیرت ناک فلکیاتی ظاہرے کی توجیہہ کے لیے آخری حد تک ناکافی ہے۔

گرہن، خلا میں پیش آنے والے اُن بے شمار معجزاتی واقعات میں سے ایک ہے جن کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: **ذلك تقدير العزيز العليم** (یٰس: 38) یعنی یہ عزیز اور علیم خدا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے:

> That is the dispostion of the Almighty, the All Knowing.

وسیع خلا میں بے شمار اجزا ہیں۔ یہ تمام اجزا مکمل طور پر خداوندِ عالم کے کنٹرول میں ہیں۔ سیاروں اور ستاروں کی گردش انتہائی حد تک خدا کے مقرر ضابطہ کی پابندی میں ہوتی ہے۔ شمسی نظام اِسی کا ایک نمونہ ہے جس کے اندر ہماری زمین واقع ہے۔ یہ نظام اپنی خاموش زبان میں اعلان کررہا ہے کہ اِس کائنات کا ایک قادرِ مطلق خدا ہے جو وسیع خلا میں اُن پر کامل کنٹرول کئے ہوئے ہے۔

اِنھیں معجزاتی واقعات میں سے ایک گرہن کا واقعہ ہے۔ سورج گرہن اور چاند گرہن ہمارے قریبی مشاہدے کی چیزیں ہیں۔ لوگ اُس کو عجوبہ کے طور پر یا زیادہ سے زیادہ ایک فلکیاتی کورس کے طور پر دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے الفاظ میں، وہ خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ اِسی لیے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب گرہن واقع ہو تو لوگ خدا کی عبادت کریں۔ اِس عبادت کو صلاۃِ کُسوف اور صلاۃِ خُسوف کہا جاتا ہے۔ گرہن کے وقت خدا کی عبادت کرنا اِس بات کا اعتراف ہے کہ گرہن ایک خدائی ظاہرہ ہے، نہ کہ محض ایک فلکیاتی ظاہرہ۔

24

دورِ جدید کا شجرِ ممنوعہ

اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان (آدم) کو پیدا کیا تو اُن کو جنت میں آباد کیا۔ پوری جنت ان کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ لیکن وہاں ایک درخت تھا جو اس سے مستثنیٰ تھا۔ اُن کو ہدایت دی گئی کہ وہ اِس درخت کے پاس نہ جائیں اور اِس کا پھل نہ کھائیں۔ لیکن وہ اس ہدایت پر قائم نہ رہ سکے اور جنت کے اُس شجرِ ممنوعہ کا پھل کھالیا۔ اِس کے بعد وہ جنت سے نکال دئے گئے۔

شجرِ ممنوعہ (forbidden tree) کا تعلق صرف ایک مخصوص درخت سے نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ سورس آف ڈسٹریکشن (source of distraction) کا نام ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو ہر دور کا ایک شجرِ ممنوعہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے کا بھی ایک شجرِ ممنوعہ ہے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو موبائل (mobile) کہا جاتا ہے۔

آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہر آدمی کی جیب میں موبائل ہوتا ہے۔ اس کا ذہن مسلسل طور پر اِسی موبائل میں مشغول رہتا ہے۔ وہ مجلس میں ہو یا مسجد میں ہو، وہ کسی جلسے میں ہو یا حالتِ سفر میں ہو، ہر جگہ اور ہر وقت وہ اپنے موبائل میں مشغول رہتا ہے۔ اِس طرح موبائل موجودہ زمانے میں ڈسٹریکشن(distraction) کا سب سے بڑا سبب بن گیا ہے۔ لوگ موبائل کے ذریعے سطحی باتوں میں مشغول رہتے ہیں، گہری باتوں کے بارے میں سوچنے کا اُن کے پاس وقت ہی نہیں۔ اِس موبائل کلچر نے تمام عورتوں اور مردوں کو معرفت سے محروم کردیا ہے۔ معاملات میں گہری سوچ سے وہ آشنا نہیں، وہ تجزیہ(analysis) کی صلاحیت سے محروم ہوگئے ہیں۔

کسی بھی شخص سے بات کیجئے تو وہ گہری عقل کی کوئی بات نہیں کہہ پائے گا۔ ہر آدمی کا ذہن کنفیوژن کا جنگل بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی بے شعوری کی حالت میں جی رہا ہے۔ زندگی ہمارے لیے ایک نہایت قیمتی موقع ہے، لیکن لوگ اِس موقع کے اعلیٰ استعمال سے محروم ہو رہے ہیں۔ اور موجودہ زمانے میں اِس کا سب سے بڑا سبب بلاشبہہ موبائل ہے۔ اِس عموم میں اگر کوئی استثناء ہے تو وہ ایک فی صد سے بھی کم ہے۔

کارٹونسٹ کے لیے تحفہ

8 فروری 2010 کو نئی دہلی میں ایک تعلیم یافتہ نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام یہ ہے: عبد الواحد (Abdul Wahid Pederson)۔ وہ ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن (Copenhagen) میں رہتے ہیں۔ ان سے پہلی ملاقات اکتوبر 2009 میں دوحہ (قطر) کی انٹرنیشنل کانفرنس میں ہوئی تھی۔ 8 فروری 2010 کی ملاقات میں انھوں نے ہمارے یہاں کا مطبوعہ اسلامی لٹریچر لیا، تاکہ وہ اس کو ڈنمارک کے لوگوں تک پہنچائیں۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ عرصے سے میری تمنا تھی کہ ڈنمارک کے اُس کارٹونسٹ کو سیرت کے موضوع پر ایک کتاب پہنچائی جائے جس کا ایک کارٹون ڈنمارک کے ایک اخبار میں چھپا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اِس سے اتفاق ہے۔ پھر میں نے ان کو سیرتِ رسول کے موضوع پر اپنی تازہ مطبوعہ کتاب ''پرافٹ آف پیس'' (The Prophet of Peace) کے دو نسخے دئے جو حال میں انٹرنیشنل اشاعتی ادارہ پینگوئن بکس (Penguin Books) نے شائع کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ان شاء اللہ قرآن کا انگریزی ترجمہ اور یہ کتاب دستی طور پر مذکورہ کارٹونسٹ تک پہنچاؤں گا۔ مسٹر عبدالواحد نے بتایا کہ کارٹون کو لے کر مسلم دنیا میں جو احتجاج کیا گیا، اُس سے باہر کے مسلمانوں میں یہ ذہن بنا کہ ڈنمارک کے لوگ اسلام کے مخالف ہیں، مگر یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ ڈنمارک کے لوگ بہت سادہ مزاج کے ہوتے ہیں۔ وہاں تیزی سے اسلام پھیل رہا ہے اور وہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

احتجاج اور مظاہرے کا طریقہ بلاشبہہ ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اگر کارٹون جیسا کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کو دعوت کے ایک موقع کے طور پر لیا جائے اور لوگوں تک اسلام کا مثبت پیغام پہنچایا جائے۔ اِسی کو قرآن میں اعراض (avoidance) کہا گیا ہے۔ اعراض کی پالیسی کے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت کے عمل میں اعراض کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہے، جتنا کہ خود دعوت کی اہمیت۔

سیاسی فتنہ

حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ سیاسی بگاڑ کے مسئلے کو لے کر حکمرانوں سے ہرگز ٹکراؤ نہ کرنا۔ اِس سلسلے میں حضرت ثوبان بن بجدد کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **إذا وُضع السیف في أمّتي، لم یُرفع عنها إلی یوم القیامة** (رواہ احمد وابوداؤد، بحوالہ مشکاۃ المصابیح، رقم الحدیث: 5406) یعنی جب میری امت کے اندر تلوار داخل کی جائے گی تو اس کے بعد وہ قیامت تک اُس سے اٹھائی نہیں جائے گی۔

اِس حدیث میں سادہ طور پر صرف ایک اخلاقی تعلیم نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک نہایت گہری سیاسی حکمت چھپی ہوئی ہے۔ اگر چہ اِس حکمت کو پوری تاریخ میں کوئی شخص دریافت نہ کرسکا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ امت کے اندر حضرت عثمان کے زمانے میں تلوار داخل ہوئی تو اب تک وہ امت سے رفع نہ ہوسکی۔

جن مسلمانوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا، انھوں نے کیوں ایسا کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کو حضرت عثمان آئڈیل سیاست کے معیار پر کم دکھائی دئے۔ مگر یہ معاملہ حضرت عثمان پر نہیں رکا۔ اس کے بعد دوبارہ سیاسی معیار کو لے کر حضرت علی کو شہید کر دیا گیا، اِسی معیار کی بنیاد پر لوگوں نے حضرت معاویہ سے جنگ کی، اِسی معیار کی بنیاد پر حضرت حسین کا ٹکراؤ یزید کے ساتھ پیش آیا، وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق، اِس دنیا میں کوئی بھی سیاسی نظام آئڈیل نہیں ہوسکتا۔ سیاسی نظام کے معاملے میں ہمارے لیے صرف ایک ہی ممکن انتخاب ہے، وہ یہ کہ سیاسی نظام کو آئڈیل سے نہ ناپیں، بلکہ آئڈیل سے کم (less than ideal) پر راضی ہوجائیں۔ ایسا نہ کیا جائے تو ایک حکمراں کو ہٹانے کے بعد جو دوسرا حکمراں آئے گا، وہ بھی لوگوں کو آئیڈیل سے کم دکھائی دے گا، اِس طرح نئے حکمراں سے دوبارہ لڑائی شروع ہوجائے گی اور پھر وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اِس معاملے میں پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کا طریقہ اختیار کرو، اور موجودہ حکمراں پر راضی رہتے ہوئے غیر سیاسی دائرے میں تعمیر اور ترقی کا کام جاری رکھو۔

امن، انصاف

انسان کو امن (peace) کی ضروت ہے اور انصاف (justice) کی ضرورت۔ بہتر سماج کے قیام کے لیے دونوں یکساں طور پر ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں کو کس طرح حاصل کیا جائے۔ عام تصور یہ ہے کہ لوگوں کو پہلے انصاف دیا جائے، اس کے بعد وہ اپنے آپ امن کے مطابق رہنے لگیں گے۔ مگر یہ سوچ فطرت کے نظام کے خلاف ہے۔ اِس دنیا میں کسی کو کوئی چیز صرف فطرت کے قانون کی پیروی کرکے مل سکتی ہے۔ فطرت کے نظام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اِس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔ فطرت کے نظام کے مطابق، امن کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ مواقع (opportunities) کو کھولتا ہے۔ اور انصاف کے حصول کا ذریعہ یہ ہے کہ اِن مواقع کو دانش مندی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ امن کا تعلق خارجی مواقع سے ہے، اور انصاف کا تعلق خود اپنی جدوجہد سے۔ تاریخ میں جب بھی کسی کو امن اور انصاف ملا ہے، اِسی فطری اصول کی پیروی کے ذریعے ملا ہے۔ اِس اصول کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اِس دنیا میں کبھی نہ امن ملا ہے اور نہ انصاف۔

جب بھی کوئی گروہ انصاف سے محروم ہو تو اس کا سبب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے انصاف کو پانے کے لیے اپنا حصہ ادا نہیں کیا۔ اگر آپ کا یہ احساس ہو کہ آپ انصاف سے محروم ہیں تو براہِ راست انصاف کے لیے لڑائی نہ چھیڑیے، بلکہ یک طرفہ طور پر صبر کی پالیسی اختیار کرکے امن قائم کیجیے۔ امن کے قائم کرتے ہی یہ ہوگا کہ مواقع اور امکانات کے تمام راستے آپ کے لیے کھل جائیں گے۔ آپ کے لئے یہ ممکن ہوجائے گا کہ آپ اِن مواقع اور اِن امکانات کو استعمال کرتے ہوئے حصولِ انصاف کی نتیجہ خیز جدوجہد شروع کردیں۔ یہی اِس دنیا میں حکمتِ حیات ہے۔ جو شخص یا گروہ اِس دنیا میں کچھ پانا چاہتا ہے، اُس کو سب سے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ وہ یک طرفہ طور پر ٹکراؤ کا طریقہ ختم کردے، اور پھر ذاتی تعمیر کے ذریعے انصاف کے حصول کی جدوجہد کرے— موجودہ دنیا میں امن پہلا قدم ہے اور انصاف دوسرا قدم۔ جو لوگ پہلا قدم نہ اٹھائیں، اُن کے لیے دوسرا قدم اِس دنیا میں مقدر نہیں۔

بچوں کا بگاڑ

ایک صاحب نے کہا کہ آج کل والدین عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ اُن کے بچے بگڑ گئے ہیں۔ اِس کا ذمے دار وہ سب سے زیادہ ٹی وی کو بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ٹی وی نے ان کے بچوں کو بگاڑ دیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ اِس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ اگر ٹی وی کا معاملہ ہے تو والدین کیوں اپنے گھر میں ٹی وی رکھتے ہیں۔ بچے خود خرید کر ٹی وی نہیں لاتے۔ یہ والدین ہیں جو بچوں کو خوش کرنے کے لیے ٹی وی لا کر اپنے گھر میں رکھتے ہیں۔ اِس لیے اِس معاملے میں اصل ذمے دار خود والدین ہیں، نہ کہ بچے۔

حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے بگاڑ کا اصل سبب لاڈ پیار (pampering) ہے۔ والدین کا نظریہ اپنے بچوں کے بارے میں یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے۔ بچے جب تک چھوٹے ہیں، ان کی خواہش کھانے اور کپڑے جیسی چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ اِس لیے چھوٹی عمر میں والدین اپنے نظریے کی غلطی سمجھ نہیں پاتے، لیکن جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو اُن کی دلچسپیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اب وہ دوستی اور آؤٹنگ اور کلب اور لوافیئر (love affair) جیسی چیزوں کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ جب ایسا ہوتا ہے تو والدین روک ٹوک کرتے ہیں، مگر بچے ان کی روک ٹوک کو قبول نہیں کرتے۔ یہ بلاشبہہ خود والدین کی غفلت کا نتیجہ ہے۔

چھوٹی عمر میں والدین نے اپنے بچوں کے اندر یہ ذہن بنایا کہ میری ہر خواہش پوری ہونی چاہیے۔ بالغ ہونے کے بعد اِس مزاج نے مزید ترقی کی۔ اب وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اُن چیزوں کی طرف جانے لگے جو والدین کو پسند نہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ''میری خواہش سب کچھ ہے'' کا مزاج بچوں کے اندر کس نے پیدا کیا، یہ خود والدین نے اپنے لاڈ پیار سے پیدا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں والدین اپنے بچوں کے ساتھ محبت کے نام پر دشمنی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

مواقع سے بے خبری

ایک نائجیریا نژاد مسلم نوجوان عمر فاروق عبدالمطلب (عمر 23 سال) نے ایک امریکی جہاز کے اندر بم دھماکہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ کامیاب نہ ہوسکا اور اس کو گرفتار کرلیا گیا۔

ٹائمس آف انڈیا (31 دسمبر 2009) میں شائع شدہ پی ٹی آئی کی رپورٹ کے مطابق، مذکورہ مسلم نوجوان نے کہا کہ — میں سمجھ سکتا ہوں کہ کس طرح عظیم جہاد پیش آئے گا۔ کس طرح مسلمان، ان شاء اللہ، جیتیں گے اور ساری دنیا پر حکومت کریں گے، اور عظیم ترین ایمپائر کو دوبارہ قائم کریں گے:

> I imagine how the great jihad will take place, how the Muslims will win, insha' Allah (God willing) and rule the whole world, and establish the greatest empire once again! (*The Times of India,* New Delhi. p. 13)

یہ صرف نائجیریا کے ایک مسلم نوجوان کی بات نہیں ہے، بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، ساری دنیا کے مسلمانوں کی سوچ یہی ہے۔ ہر مسلمان کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ کی یاد میں جیتا ہے اور اُس کو دوبارہ واپس لانا چاہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ مسلمان اِس کے لیے عملی جہاد کر رہے ہیں اور کچھ مسلمان فکری جہاد۔ مگر یہ زمانۂ حاضر سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

آج اسلام اور مسلمانوں کو جو عظیم مواقع حاصل ہیں، وہ پچھلی تمام مسلم سلطنتوں کے زمانے میں کبھی موجود نہ تھے۔ مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ اِس معاملے کو بمعنیٰ سلطان (in terms of Sultan) سوچتے ہیں۔ اگر وہ اِس معاملے کو بمعنی مواقع (in terms of opportunities) سوچیں تو اچانک وہ دریافت کریں گے کہ جس ایمپائر کو دوبارہ قائم کرنے کا وہ خواب دیکھ رہے ہیں، وہ زمانی تبدیلیوں کے نتیجے میں بالفعل قائم ہو چکا ہے۔ اِس معاملے میں، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود اپنی سوچ کو بدلیں، نہ یہ کہ وہ مفروضہ سیاسی حریفوں سے بے فائدہ ٹکراؤ جاری رکھیں۔ اِس قسم کے ٹکراؤ کا کوئی مثبت نتیجہ نہ پہلے نکلا ہے، اور نہ آئندہ اس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا ہے۔

زمین کی زرخیز سطح

سیارۂ ارض کی سطح پر جو زرخیز مٹی (soil) پائی جاتی ہے، اس قسم کی زرخیز مٹی کسی بھی دوسرے سیارے پر موجود نہیں۔ یہ زرخیز مٹی مختلف اسباب سے کم ہورہی ہے اور اس کے اندر پیداوار کی صلاحیت گھٹتی جارہی ہے۔ اِس موضوع پر سائنٹفک رسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ حالت اگر باقی رہے، تو اگلے 60 برس کے اندر زمین کی زرخیزی ختم ہوجائے گی۔ اِس رپورٹ کا خلاصہ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (6 فروری 2010) میں چھپا ہے۔ اِس رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

Fertile soil is being lost faster than it can be replenished and will eventually lead to the "topsoil bank" becoming empty, researchers told an Australian conference. They said farming soil could run out within 60 years, leading to a catastrophic food crisis and drastically higher prices for consumers, reports the Telegraph. Chronic soil mismanagement and over farming causing erosion, climate change and increasing populations were to blame for the dramatic global decline in suitable farming soil, the scientists said. An estimated 75 million tons of soil is lost annually with more than 80% of the world's farming land "moderately or severely eroded." John Crawford, professor of Sustainable Agriculture at the University of Sydney, who presented the study, said: "It could be as little as 60 years and that is a scary figure because it is not obvious that we have time to reverse decline and still meet future demands for food." The Telegraph quoted Crawford as saying. (*The Times of India,* New Delhi. February 6, 2010)

اِس طرح کی رپورٹیں سائنٹفک کمیونٹی کی طرف سے بار بار آرہی ہیں— میٹھے پانی کے ذخیرے سمندروں میں جا کر دوبارہ کھاری پانی بن رہے ہیں، فضا کی آلودگی (pollution) میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے، خلاصہ یہ کہ وہ تمام اسباب جو انسان کی بقا کے لیے ضروری تھے، وہ شدید طور پر درہم برہم ہورہے ہیں۔ یہ واقعات اِس بات کی کھلی علامت ہیں کہ قیامت بہت قریب آگئی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی عیسوی انسان کے لیے آخری صدی ہے، اس کے بعد انسان کی نسل بائیسویں صدی میں داخل ہونے والی نہیں۔

صحیح مشورہ

مولانا سعید احمد اکبرآبادی (وفات: 1982) اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے۔ وہ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بخوبی دست گاہ رکھتے تھے۔ اُن کا ایک واقعہ ماہ نامہ معارف (جنوری، 2010، صفحہ 71) سے لے کر یہاں نقل کیا جارہا ہے: ایک مرتبہ اپنے ابتدائی دور میں جب کہ میرے ارزاں قسم کے مضامین ومقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، ایک نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف جیسے معیاری رسالے کے لائق ہے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں ارسال کردی۔ مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ تحریر فرمایا: آپ اِس نظم نویسی کے چکّر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبے سے گری ہوئی چیز ہے۔ کچھ محنت کیجئے اور مقالہ نویسی پر توجہ دیجئے۔ قوم کو آپ سے اِسی کی توقع ہوسکتی ہے اور یہی ہونی چاہئے۔ مولانا اکبرآبادی پر اِس خط کا یہ ردعمل (اثر) ہوا کہ بقول اُن کے مولانا کے گرامی نامے کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا:

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی   تو نے وہ ٹھوکر لگائی، چشمِ عبرت کھل گئی

مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ مشورہ بلاشبہہ ایک صحیح مشورہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ تحریری کام کی دو قسمیں ہیں— ایک، وہ جس کو فکشن (fiction) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا، وہ جس کو نان فکشن (non-fiction) کہا جاتا ہے۔ شاعری وغیرہ، فکشن کے دائرے کی چیزیں ہیں۔ اِس قسم کی تحریریں حقیقۃً صرف ذہنی تفریح کا سامان ہوتی ہیں، تعمیری اعتبار سے اُن کی کوئی اہمیت نہیں۔

نان فکشن میں تمام علمی موضوعات آتے ہیں۔ مثلاً تاریخ اور سائنس، وغیرہ۔ کسی تعلیم یافتہ آدمی کے لیے اصل کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ نان فکشن کے دائرے کو اپنا میدانِ مطالعہ بنائے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کسی علمی موضوع کو منتخب کرکے اس کا گہرا مطالعہ کرے اور اس پر مقالات یا کتابیں لکھے— انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی کے لیے اعلیٰ مقصد کا انتخاب کرے، وہ اعلیٰ مقصد سے کم تر کسی چیز میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ کرے۔

قناعت، عدم قناعت

خدا نے جس منصوبے کے تحت، انسان کو پیدا کیا ہے، اس کے مطابق، انسان کی زندگی دو دوروں (periods) میں بٹی ہوئی ہے۔ اِن میں سے ایک کو دنیا کہا جاتا ہے، اور دوسرے کو آخرت۔ اِس طرح، ہر انسان کو دو تقاضوں کے درمیان جینا پڑتا ہے۔ ایک تقاضا تعمیر دنیا کا ہوتا ہے اور دوسرا تقاضا تعمیر آخرت کا تقاضا۔

یہاں یہ سوال ہے کہ اِن دونوں تقاضوں کے درمیان کس طرح موافقت پیدا کی جائے، زندگی کا وہ نقشہ کیا ہے جس میں دونوں تقاضوں کی رعایت موجود ہو۔ اِس کا قابلِ عمل فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ ہے — دنیا کے معاملے میں قناعت، اور آخرت کے معاملے میں عدم قناعت۔

انسان کے لیے اپنی موجودہ ساخت کے اعتبار سے یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں تقاضوں کو یکساں درجہ دے۔ وہ دنیا کی چیزوں میں بھی بھر پور توجہ دے، اور آخرت کے معاملے میں بھی بھر پور توجہ دے۔ اِس قسم کی برابری کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں عملی طور پر صرف یہ ہوسکتا ہے کہ انسان اِس معاملے میں ترجیح (priority) کا طریقہ اختیار کرے، یعنی وہ دونوں میں سے ایک کو اوّلین (primary) اہمیت دے، اور دوسرے کو وہ ثانوی (secondary) درجے میں رکھے۔

اِس فارمولے کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا کے معاملے میں قناعت (contentment) کا طریقہ اختیار کرے، اور آخرت کے معاملے میں عدم قناعت (discontentment) کا طریقہ، یعنی دنیا کی چیزوں کے معاملے میں اُس کا مزاج یہ ہو کہ جو کچھ آخرت کا نقصان کیے بغیر مل جائے، اُس کو وہ کافی سمجھے۔ جہاں تک آخرت کا معاملہ ہے، اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ اور اپنی زیادہ سے زیادہ توانائی وہ اس کے حصول میں لگا دے — دنیا کے معاملے میں وہ کم پر راضی ہو جائے، اور آخرت کے معاملے میں وہ زیادہ سے زیادہ کے لیے کوشش کرتا رہے۔

اپنے آپ کو جانئے

ہرعورت اور ہرمرد کے لیے اِس دنیا میں پہلا کام یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو دریافت کرے۔ وہ جانے کہ میں کون ہوں، میں اِس دنیا میں کس لیے آیا ہوں، میری زندگی کی منزل کیا ہے، میری کامیابی کیا ہے اور میری ناکامی کیا— یہی وہ دریافت ہے جہاں سے زندگی کے حقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب کا ایک قول ہے: قیمة المرء ما یُحسِنه، یعنی کسی انسان کی قیمت اُس کے اُس عمل میں ہے جس کو وہ ممتاز طور پر انجام دے:

The value of a person lies in excellence.

اصل یہ ہے کہ ہر انسان کا ایک ''مایحسنه'' ہوتا ہے۔ ہر انسان فطری طور پر کوئی ایسی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے جس میں وہ خصوصی ملکہ رکھتا ہو۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ فطرت کے دئے ہوئے اپنے اِس خصوصی عطیہ (ما یحسنه) کو دریافت کرے اور پھر اس کے مطابق، وہ اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ اِس دنیا میں کسی کے لیے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ زیادہ بڑی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے ''مایحسنه'' کو دریافت نہیں کر پاتے۔ وہ اپنے آپ کو ایسے کام میں لگا دیتے ہیں جس کے لیے وہ پیدا نہیں کئے گئے تھے اور پھر ساری زندگی وہ مایوسی (despair) کا شکار رہتے ہیں اور آخر کار اِسی حال میں مرجاتے ہیں۔

خالق (Creator) نے ہر انسان کو کسی بڑے کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر عام طور پر یہ حال ہے کہ لوگ اِسی بڑے کام کو نہیں کر پاتے۔ وہ چھوٹی کامیابی میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور بڑی کامیابی تک پہنچنے سے وہ قاصر رہتے ہیں۔

اِس المیہ (tragedy) سے بچنا صرف اُس انسان کے لیے ممکن ہے جو اپنا بے رحمانہ محاسبہ (merciless introspection) کرنے کے لیے تیار ہو۔

نفسیاتی خودکشی سے بچیے

ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ میں مستقل طور پر منفی احساس میں مبتلا رہتا ہوں۔ اِس کا علاج کیا ہے۔ میں نے اِس کا متعین سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے طور پر میرے گھر میں ٹی وی چلتا ہے۔ میں ایک عالم آدمی ہوں اور ٹی وی کو برا سمجھتا ہوں۔ میں اُن کو منع کرتا ہوں، لیکن گھر والے میری بات نہیں سنتے۔ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔

میں نے کہا کہ اِس طرح کی صورتِ حال میں اسلام کا فارمولا یہ ہے — اگر تم دوسروں کو نہ بچا سکو، تو تم اپنے آپ کو بچاؤ۔ اِسی کا نام صبر ہے۔ صبر کوئی بزدلی کی بات نہیں، صبر زندگی کی ایک عظیم حکمت ہے۔ اجتماعی زندگی میں آدمی کو ہمیشہ اپنے مزاج کے خلاف ماحول میں رہنا پڑتا ہے۔ ایسے ماحول میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اگر تم پُر امن طور پر دوسروں کی اصلاح کرسکو تو تم دوسروں کی اصلاح کرو۔ اور اگر ایسا کرنا تمھارے لیے ممکن نہ ہو تو تم خود اپنے آپ کو اُس برائی سے بچاؤ۔ اِسی کا نام صبر ہے۔

منفی احساس میں مبتلا ہونا کوئی سادہ بات نہیں، یہ نفسیاتی خودکشی کے ہم معنیٰ ہے۔ ایسے موقع پر دوسروں کے خلاف تشدد کرنا جتنا برا ہے، اتنا ہی برا یہ بھی ہے کہ آدمی منفی احساس میں مبتلا رہے۔ پہلا طریقہ اگر دوسروں کے خلاف ظلم ہے، تو دوسرا طریقہ خود اپنے خلاف ظلم۔ اور دونوں ہی طریقے بلاشبہہ یکساں طور پر غیر مطلوب طریقے ہیں۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو آزادی دی ہے۔ قیامت تک کسی کی آزادی ختم ہونے والی نہیں، اِس لیے قیامت تک برائی کا کلی خاتمہ بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لیے صرف ایک ہی ممکن صورت ہے، وہ یہ کہ وہ امن اور خیر خواہی کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اور جب وہ دیکھے کہ لوگ اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں، اُس وقت وہ وہی کرے جس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **عليك بنفسك، ودَعْ عنك العوام (أبو داؤد، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي)** یعنی اپنے آپ کو بچاؤ اور لوگوں کے معاملے کو اللہ کے حوالے کردو۔

سوال و جواب

سوال

ماہ اکتوبر (2009) کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ویسے تو آپ کی ہر تحریر مبنی برحقیقت اور گہرے درد میں ڈوبی ہوتی ہے، لیکن مذکورہ شمارہ میں جو کچھ آپ نے مسئلہ فلسطین پر سپرد قرطاس کیا ہے، میں اس سے کُلی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ یہ حقیقت دراصل بہت لوگوں کے گوشہائے قلب و دماغ میں ہے، مگر اندیشۂ مخالفت، خوفِ بدنامی، اتہام والزام کا ڈر اظہار سے مانع ہے۔ مجھے دل کی گہرائیوں سے سلام کرنے کو جی چاہتا ہے آپ کے عزیمت بھرے اور شجاعتِ اظہار سے پُر قلم کو۔ ہوسکتا ہے بہت سے تنگ دماغوں اور مزاجِ شریعت سے نا آشنا لوگوں کے لئے یہ بات نا قابلِ قبول بلکہ ایمان و اسلام کے منافی ہو، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو بات آپ نے رقم فرمائی ہے، وہ نصوص ثابتہ اور تاریخ سے واضح طور پر سمجھ میں آرہی ہے۔ قُدس اور فلسطین کا مسئلہ جو ساری امتِ اسلامیہ کے لیے سوہانِ روح بن چکا ہے، اس کی افزائش میں انا کا بہت دخل ہے۔ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اگر سوچا جائے تو یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔ میری تو تمنا اور خواہش ہے کہ اس مسئلہ کو صرف الرسالہ تک ہی محدود نہ کر دیا جائے بلکہ عالمی مسلم اور یہودی رہنماؤں کے سامنے اس بات کو پُر امن حل کے طور پر پیش کیا جائے۔ انٹرنیشنل لیول پر اس بات کو رکھا جائے، اور مسئلہ کے اس غیر متشددانہ حل کو پیش کیا جائے تا کہ اہل عقل اس قندیل کی روشنی میں مستقبل کی راہوں کا تعین کر سکیں۔ امید کہ آپ اس بات کی طرف توجہ دیں گے۔ محترم، اس پورے مضمون میں ایک سوال میرے دل میں کھٹکتا رہا کہ آپ نے صفحہ نمبر 21 پر یہ بات رقم فرمائی ہے کہ — نزولِ قرآن کے وقت یہاں کوئی عمارت نہیں تھی، بلکہ صرف ہیکل کی خالی جگہ (site) تھی۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں 638ء میں مسلمان یروشلم میں داخل ہوئے۔ حضرت عمر نے ہیکل کی جگہ پر کوئی عمارت تعمیر نہیں کی۔ بعد کو اموی دور میں خلیفہ عبدالملک بن مروان وفات 706ء نے ہیکل کی جگہ 688ء میں موجودہ مسجد اقصیٰ تعمیر کی۔ مگر قرآن میں جہاں واقعہ اسراء کا تذکرہ ہے— **من المسجد الحرام إلى المسجد الاقصىٰ** (بنی إسرائیل: 1)۔ وہاں مسجد اقصی کا صاف طور پر نام لیا گیا ہے۔ اور صحیح ترین روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ اقصیٰ

میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی ہے اوربعض تاریخی روایات سے یہ بات بالکل صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ نزول قرآن کے وقت وہاں مسجد اقصیٰ موجودتھی۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں فتح بیت المقدس کے تحت حضرت عمر کے بارے میں ذکرکیا ہے ”**ودخل المسجد من الباب الذی دخل منه رسول الله صلی اللـه علیه وسلم** (البدایة والنهایة 8/55) حافظ ابن عساکر دمشقی نے اپنی مشہور کتاب **المستقصیٰ فی فضائل المسجد الاقصیٰ** میں عہد فاروقی میں فتح بیت المقدس اور تعمیر وتوسیع مسجد اقصیٰ کا بڑی تفصیل سے ذکرکیا ہے۔ نیز ابن کثیر نے المسجد الاقصیٰ کے تحت حضرت عمر کے بارے میں ذکرکیا ہے: **ثم نقل التراب عن الصخرة في طرف ردائه** (البداية والنهاية 8/58)۔ حافظ ضیاءالدین مقدسی نے امام احمد کے واسطہ سے ایک لمبی تاریخی روایت ذکرکی ہے جس میں نزول قرآن کے وقت مسجد اقصیٰ کے وجوداور عہد فاروقی میں اس کی تعمیر وتوسیع صاف طور پر معلوم ہوتی ہے۔ براہِ کرم، اس شبہہ کا ازالہ اوراس کنفیوژن کودور فرمائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ (محمد ثناءاللہ قاسمی، محبوب نگر، آندھرا پردیش)

جواب

1- مسجد اقصیٰ کے بارے میں مسلم تاریخوں میں جو بات کہی گئی ہے، وہ میرے علم میں ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخی کتابوں کے علاوہ، جو دیگر تاریخی ریکارڈ ہے، وہ اِس سے مختلف ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ کہ دونوں میں سے ایک کے بیان کو اصل مانیں اور دوسرے بیان کی تاویل کریں۔ میں نے اِس معاملے میں، مسلم مورخین کے بیان کو تاویل کے خانے میں ڈالا ہے اور دوسرے تاریخی ریکارڈ کو اصل قرار دیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ابن خلدون (وفات: 1406ء) سے پہلے، مسلم تاریخ نگاروں کے یہاں عام طور پر علمی ذوق کا رواج نہ تھا۔ وہ خالص تاریخی واقعات کے ساتھ مروّجہ قصہ کہانیوں کو بھی اس میں شامل کردیتے تھے۔ اِس لیے اُس زمانے میں لکھی ہوئی تاریخوں پر کلّی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

2- مسجد اقصی کے بارے میں جو بات میں نے لکھی ہے، وہ بظاہر عمومی تصور کے خلاف ہے، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اِس رائے کی اصل دوسرے مسلم محققین کے یہاں بھی موجود ہے۔ مثال کے

طور پر عبداللہ بن احمد النسفی (وفات: 1310ء) نے اپنی تفسیر ''مدارك التنزيل'' میں سورہ الاسراء کی آیت نمبر 1 کے تحت مسجد اقصیٰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: **هو بيت المقدس، لأنه لم يكن حينئذ وراءه مسجد** (جلد 2، صفحہ 306) یعنی مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے، کیوں کہ اُس وقت وہاں کوئی مسجد موجود نہ تھی۔ واضح ہو کہ قرآن کی آیت میں مسجد حرام سے مراد مسجد ہے، لیکن مسجد اقصیٰ سے مراد معروف مسجد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد عبادت گاہ ہے، یعنی یہودی عبادت گاہ جس کو ہیکلِ سلیمان (Solomon's Temple) کہا جاتا ہے۔

محمد بن احمد الانصاری القرطبی (وفات: 1273ء) نے اپنی تفسیر ''**الجامع لأحكام القرآن**'' میں سورہ آل عمران کی آیت نمبر 96 کے تحت مسجدِ اقصیٰ کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: **وأمّا المسجد الأقصىٰ، فبناه سليمان عليه السلام، كما خرجه النسائي بإسناد صحيح من حديث عبد الله بن عمرو** (جلد 4، صفحہ 173) یعنی جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے، تو اس کو سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا، جیسا کہ النسائی نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ العثمانی (وفات: 1810ء) نے اپنی تفسیر ''**التفسير المظهري**'' میں سورہ الاسراء کی اِس آیت کے تحت مسجد اقصیٰ کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے ہیں: **المسجد الأقصى، يعنى البيت المقدس سُمّي أقصى لبُعده من المسجد الحرام، ولم يكن حينئذ ورائه مسجد** (جلد 5، صفحہ 399) یعنی مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے۔ بیت المقدس کو مسجد اقصیٰ کا نام اِس لیے دیا گیا کہ وہ مکہ کی مسجد حرام سے دور یروشلم (فلسطین) میں واقع تھی۔

مولانا عبد الماجد دریابادی (وفات: 1977ء) نے اپنی انگریزی تفسیر ''تفسیر القرآن'' میں سورہ الاسراء کی اِس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — یہاں لفظ مسجد سے مراد جگہ (site) ہے، نہ کہ مسجد کی کوئی عمارت:

Masjid: properly denotes the site, not
the building of a mosque (Vol. 3, p. 2)

اِس معاملے کی مزید تفصیل الرسالہ کے شمارہ، دسمبر 2009 میں صفحہ 41-39 کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

3- آپ نے لکھا ہے کہ اِس مسئلے کو صرف الرسالہ تک محدود نہ کردیا جائے، بلکہ عالمی سطح کے مسلم اور یہودی رہنماؤں کے سامنے اِس بات کو ایک پر امن حل کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ اہلِ عقل اس کی روشنی میں مستقبل کی راہوں کا تعین کرسکیں۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کام بالفعل ہورہا ہے۔ 29-27 اکتوبر 2008 کو اسرائیل کی راجدھانی تل ابیب (Tel Aviv) میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس خاص اِسی موضوع پر ہوئی۔ اِس میں دنیا کے 50 ملکوں کے رہنما شریک ہوئے۔ اِن میں ریاست اسرائیل کے صدر مسٹر شمعون پیریز کے علاوہ اعلیٰ سطح کے یہودی، مسیحی اور مسلم رہنما موجود تھے۔ فلسطین کے عرب نمائندے بھی بڑی تعداد میں اِس کانفرنس میں شریک تھے۔ اِس کانفرنس کی دعوت پر راقم الحروف نے اپنے 6 ساتھیوں کے ہم راہ اِس میں شرکت کی، اور وہاں تقریر اور ڈسکشن کے ذریعے اپنا نقطۂ نظر لوگوں کے سامنے رکھا۔ اِس موقع پر شرکاءِ کانفرنس کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور اسلامی لٹریچر دیا گیا۔ اس کے علاوہ، خاص اِسی موقع کے لیے انگریزی زبان میں 15 صفحات کا ایک پمفلٹ تیار کیا گیا تھا۔ اِس کا ٹائٹل یہ تھا:

How to Establish Peace in the Holy Land— Ten Point Program

یہ پمفلٹ بڑے پیمانے پر کانفرنس کے شرکاء اور مقامی لوگوں کو دیا گیا۔ اِس پمفلٹ کو سی پی ایس کی ویب سائٹ (www.cpsglobal.org) پر دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال

الحمد للہ میں ’’الرسالہ‘‘ کا مطالعہ گذشتہ دو سالوں سے کررہا ہوں۔ الرسالہ کے ہر مضمون سے نفع حاصل ہوتا ہے۔ اب میرے ساتھ یہ معاملہ ہوگیا ہے کہ نہ صرف میں خود الرسالہ پڑھتا ہوں، بلکہ اپنے دوستوں کو بھی پڑھنے کے لیے دیتا ہوں، کیوں کہ الرسالہ میں اسلامی تعلیمات کو اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پڑھنے اور سننے والے کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ میرے ذہن میں کچھ سوالات تھے جو مسلسل الرسالہ کا مطالعہ کرنے سے دور ہوگئے، لیکن دورانِ مطالعہ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ چند موضوع پر آپ کے افکار متضاد ہوتے ہیں مگر کبھی اس کے ذکر کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مگر گذشتہ دو ماہ

(جنوری اور فروری 2009) کے الرسالہ میں ایک ہی موضوع پر دو مختلف آراء نے مجھے مجبور کیا کہ اِس طرف آپ کی توجہ مبذول کروں۔ جنوری اور فروری 2009 کے الرسالہ کو راقم نے پورا پڑھا۔ جنوری کے شمارہ میں ''ظاہری تبدیلی، حقیقی تبدیلی'' کے زیرِ عنوان آپ نے امریکی میگزین ٹائم (17 نومبر 2009) پر شائع براک اوباما کی تقریر کا پہلا جملہ ''تبدیلی امریکا تک پہنچ گئی'' Change has come to America پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ امریکا میں جو چیز بدلی ہے، وہ صرف وہاں کی صدارت ہے۔ نہ کہ وہاں کے حالات۔ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ Change has come to American Presidency (صفحہ 13)

اِسی موضوع پر فروری 2009 کے ''الرسالہ'' میں آپ رقم طراز ہیں کہ ''واقعہ بتاتا ہے کہ وہائٹ ہاؤس میں وہائٹ پریزیڈینٹ کی جگہ ایک بلیک پریزیڈنٹ آ گیا ہے۔ یہ ایک بڑا واقعہ ہے۔ براک اوباما نے جیت کے بعد اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ امریکا میں تبدیلی آ گئی۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں تبدیلی آ گئی'' (قبرص کا سفر، صفحہ 34)۔ مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک جگہ آپ کہتے ہیں کہ امریکا میں جو چیز بدلی ہے، وہ صرف وہاں کی صدارت ہے، نہ کہ وہاں کے حالات۔ اور دوسری جگہ آپ صرف امریکا کی تبدیلی کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ دنیا کی تبدیلی خیال کر رہے ہیں۔

جنوری 2009 کے ہی شمارہ میں آپ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''لوگ ظاہری تبدیلی کو حقیقی تبدیلی سمجھ لیتے ہیں۔ پانچ سال تک براک اوباما اس طرح پُرشور الفاظ بولتے رہیں گے، یہاں تک کہ جب پانچ سال پر ان کا دورِ صدارت ختم ہوگا تو معلوم ہوگا کہ حقیقی معنوں میں کوئی بھی ایسا کام نہیں ہوا، جس کو تبدیلی (change) کہا جا سکے، امریکا کے اصل مسائل بدستور موجود ہیں، بلکہ اُن میں مزید اضافہ ہو گیا'' (صفحہ 13)۔ مذکورہ دو شماروں میں آپ کے اقتباسات خود ایک دوسرے کو رد کر رہے ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ اس تضاد بیانی سے متعلق وضاحت فرما کر میری الجھن کو دور کریں۔ (شاہد جمیل، بیل گچھیا اردو ہائی اسکول، کولکاتا)

جواب

آپ کا خط مورخہ 30 مارچ 2009 ملا۔ آپ الرسالہ کو مسلسل اپنے مطالعے میں رکھیں اور ہر

شمارے کو کئی بار پڑھیں۔ ان شاء اللہ آپ کے تمام شبہات دور ہو جائیں گے۔

مذکورہ دونوں مضامین میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں بیان دو پہلوؤں کے اعتبار سے ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے امریکا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن صدارتی انتخاب بتاتا ہے کہ امریکا میں ایک نیا رجحان ضرور پیدا ہوا ہے، ورنہ وہاں ایک بلیک شخص کو صدر کے لیے منتخب نہ کیا جاتا۔ ہر معاملے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ کبھی ایک پہلو کے اعتبار سے بات کہی جاتی ہے اور کبھی دوسرے پہلو کے اعتبار سے۔ اِس قسم کی مثالیں قرآن اور حدیث میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں اہلِ ضلالت کے لیے ایک جگہ اعمیٰ (الإسراء: 72) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اُنھیں کے لیے دوسری جگہ بصرِ حدید (ق: 22) کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں باتیں دو پہلوؤں کے اعتبار سے ہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 201

1- 31-30 مئی 2009 کو تولہ مولہ (گاندر بل) کشمیر میں ''کھیر بھوانی'' کا سالانہ میلہ منعقد ہوا۔ حلقہ الرسالہ کشمیر کی طرف سے وہاں غیر مسلموں کے درمیان تقریباً 300 انگریزی اور ہندی ترجمہ قرآن کی کاپیاں اور دیگر دعوتی لٹریچر مفت تقسیم کیا گیا۔ مقامی ہندوؤں (کشمیری پنڈتوں) کے علاوہ، ڈی سی اور ایس پی گاندربل نے اِس دعوتی کام کو کافی سراہا۔ پروفیسر شاد حسین، ڈاکٹر طلعت قیوم، ڈاکٹر عابد پانڈے، حاجی غلام قادر، وغیرہ نے اِس دعوتی کام میں اہم رول ادا کیا۔

2- نئی دہلی کے مرکزی چرچ (Cathedral) کے وسیع لان میں 22 نومبر 2009 کی شام کو ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام گولڈن جبلی (Archdiocese of Delhi's Golden Jubilee) کے موقع پر کیا گیا۔ اِس پروگرام میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اور سرکاری نمائندوں کے علاوہ، انڈیا کے مختلف صوبوں کے تقریباً 10 ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اپنی ٹیم کے افراد کے ساتھ اِس پروگرام میں شرکت کی اور انگریزی زبان میں اسلام اور مسیحیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی طرف سے حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

3- حکومت شارجہ (عرب امارات) کی جانب سے 28 واں انٹرنیشنل بک فیئر 11-21 نومبر 2009ء منعقد کیا گیا۔ یہ بک فیئر شارجہ ایکسپو سینٹر (Expo Center) میں ہوا۔ اس بک فیئر میں دنیا بھر سے ایک ہزار ناشرینِ کتب نے شرکت کی۔ انڈیا سے گڈورڈ بکس (نئی دہلی) نے حصہ لیا۔ کثیر تعداد میں لوگ گڈورڈ کے اسٹال پر آئے اور کتابیں حاصل کیں۔ صدر اسلامی مرکز کے انگریزی ترجمہ قرآن کو بہت پسند کیا گیا۔ اس کا ہدیہ مقامی کرنسی کے اعتبار سے بہت کم رکھا گیا تھا، یعنی صرف 2 درہم۔ لوگوں نے بڑی تعداد میں اِس ترجمہ قرآن کو حاصل کیا۔ اس بک فیئر کا افتتاح شارجہ کے موجودہ حکمراں دکتور سلطان القاسمی نے کیا تھا۔

9- دوحہ (قطر) میں 22-31 جنوری 2010 کو ایک انٹرنیشنل بک فیئر منعقد ہوا۔ یہ بک فیئر دوحہ ایگزی بیشن سنٹر میں لگایا گیا۔ یہاں گڈورڈ بکس (نئی دہلی) نے اپنا اسٹال لگایا۔ یہ اسٹال انڈیا کا واحد بک اسٹال تھا۔ لوگوں نے بڑے پیمانے پر گڈورڈ کے اسٹال سے دیگر کتابوں کے علاوہ، قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی پمفلٹس حاصل کیے۔ اِس موقع پر مولانا عبد الباسط عمری نے اپنا بھرپور تعاون دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

10- نئی دہلی کے پرگتی میدان میں 30 جنوری تا 7 فروری 2010 کو ایک انٹرنیشنل بُک فیئر لگایا گیا۔ یہاں گڈورڈ بکس (نئی دہلی) کے دو اسٹال تھے۔ یہ بک فیئر بھی ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا۔ مذکورہ تینوں بک فیئر میں اسٹال کا انتظام شاہ عمران حسن نے سنبھالا۔

4- نئی دہلی کے ٹی وی چینل (Time Now) کی ٹیم نے 24 نومبر 2009 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق بابری مسجد کے انہدام (1992) کے بارے میں لبراہن کمیشن کی رپورٹ

سے تھا۔ جوابات کے تحت بتایا گیا کہ اب یہ اِشو ایک تاریخی اشو بن چکا ہے۔ جذباتی تقریریں کر کے اُس پر لوگوں کو بھڑکانا کوئی صحت مند پالیسی نہیں۔ اِس وقت ملک کے سامنے اور ملک کے مسلمانوں کے سامنے زیادہ بڑے بڑے اشو ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اشو معیاری تعلیم کا ہے جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ زیادہ حقیقت پسندانہ پالیسی اختیار کی جائے۔ آخر میں ٹی وی چینل کے افراد کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

5- ہندی روزنامہ ''امراجالا'' (نوئڈیا) کے نمائندہ ڈاکٹر گووند سنگھ نے 26 نومبر 2009 کو اپنے اخبار کے لیے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا: ہندستانی مسلمان 1947 کے بعد۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا واحد سبب ہے — جدید تعلیم میں ان کا پچھڑ جانا۔ بابری مسجد کے سوال پر اُن کو بتایا گیا کہ اِس مسئلے کا عملی حل صرف ایک ہے، وہ یہ کہ مسلمان ایک مسجد پر چپ ہو جائیں، اور ہندو ایک مسجد کے بعد دوسری مسجدوں پر چپ ہو جائیں۔ لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں بتایا گیا کہ اُس سے صورتِ حال میں کوئی بدلاؤ آنے والا نہیں۔ اِس قسم کے مسائل کسی کمیشن کی رپورٹ سے حل نہیں ہوتے۔

6- امریکا کی جارج ٹاؤن یونی ورسٹی (Georgetown University) میں ایک رسرچ ہوئی ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ یہ ریسرچ 202 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام یہ ہے: The 500 Most Influential Muslims۔ اس کتاب میں صدر اسلامی مرکز مولانا وحید الدین خاں کو دنیا کا ''اسپریچول ایمبیسڈر'' قرار دیا گیا ہے:

> Maulana Wahiduddin Khan has been called 'Islam's Spiritual ambassador to the world'. Khan aims to teach about Islam as a spiritual way of life, an approach that is popular among Indian, both Muslim and non-Muslim. He established the Islamic centre in Delhi in 1970, and has written over 200 books since. (p. 94)

اس کی رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا (12 دسمبر 2009) میں بھی شائع ہوئی ہے۔

7- زی سلام (Zee TV) کے اسٹوڈیو میں 26 دسمبر 2009 کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ہوا۔ سوالات کا موضوع سی پی ایس انٹرنیشنل (نئی دہلی) کے تعارف اور موجودہ مسلمانوں کے مسائل تھا۔ جوابات کے دوران اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔

8- نئی دہلی کے ٹریول پیشن (Travel Passion) کی طرف سے 7 جنوری 2010 کو امریکا کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک گروپ اسلامی مرکز میں آیا۔ اِس گروپ کے قائد مسٹر ورون گاندھی (گاندھی جی کے پوتے) تھے۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ اِس موقع پر صدر اسلامی نے ''تعارفِ اسلام'' کے موضوع پر انگریزی زبان میں ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ تقریر کے بعد مسٹر ورون گاندھی نے مائک پر کہا کہ آج میں نے اسلام کے بارے میں اتنا زیادہ سیکھا ہے جو میں نے اپنی 67 سال کی عمر میں کبھی نہ سیکھ سکا تھا۔

اِس موقع پر قرآن کے انگریزی ترجمہ کے علاوہ، صدر اسلامی مرکز کی نئی کتاب (The Prophet of Peace) گروپ کے لوگوں کو دی گئی۔ بعد کو ان کے ایک ذمے دار کا خط ملا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> Dear Center for Peace and Spirituality Team, I would like to thank you for extending the invitation for Arun and Tushar Gandhi as well as the American delegation to come enjoy an evening lecture at the Center for Peace and Spirituality in New Delhi by Maulana Wahiddudin Khan. I would also like to express my gratitude for the gifts of Maulana Wahiduddin Khan's copy of The Quran in which I am in the middle of reading and "The Prophet of Peace." After listening to his lecture I was very interested to hear the distinction he was making in the interpretation relative to the Quran's position on terrorism, jihad, and misconceptions about Islam's early history. This is fascinating and a message that we are interested in. (Lynnea Bylund, S. California, USA)

11- 23 جنوری 2010 کے اخبارات میں سپریم کورٹ آف انڈیا کا یہ فیصلہ آیا کہ مسلم خواتین کو دوسرے تمام ووٹروں کی طرح اپنا فوٹو شناختی کارڈ پر لگوانا ضروری ہے۔ اسٹار ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے اِس موضوع پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ بتایا گیا کہ جو لوگ اس کو شریعت میں مداخلت کہتے ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کا تعلق حکم شرعی سے نہیں ہے، بلکہ ضرورتِ شرعی سے ہے، اور تمام علماء ضرورتِ شرعی کے لیے خواتین کے فوٹو کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مثلاً پاسپورٹ پر خواتین کا فوٹو لگانا، یا حج کے شناختی کارڈ پر فوٹو لگانا، وغیرہ۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کا تعلق پردے کے استعمال کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ ووٹر کے شناختی کارڈ (identity card) سے ہے، اور اس میں قباحت کا کوئی سوال نہیں۔ یہ انٹرویو 23 جنوری 2010 کو ریکارڈ کیا گیا۔

12- پوپ کی سرپرستی میں ایک مسیحی تنظیم قائم ہے جس کا صدر دفتر روم (اٹلی) میں ہے۔ اِس تنظیم کا نام یہ ہے— Cammunity of Saint Egidio۔ اس کمیونٹی کے تین بڑے عہدے داران 23 جنوری 2010 کو مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی ملاقات کی۔ گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ جدید عالمی مسائل میں مسلمانوں کا رول کیا ہونا چاہیے، نیز یہ کہ مسلم مسیحی اتحاد مؤثر طور پر کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے۔

13- دوردرشن (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں 28 جنوری 2010 کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اِس کا موضوع برقع کے بارے میں سپریم کورٹ آف انڈیا کا فیصلہ تھا۔ اینکر کے علاوہ، اِس ڈسکشن میں مز سعدیہ خان اور مسٹر بہاء الدین خان شامل تھے۔ اِس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو اِس ڈسکشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ سپریم کورٹ نے نفسِ برقع یا حجاب پر کچھ نہیں کہا ہے۔ اس نے صرف یہ کہا ہے کہ ووٹر کی شناخت کے عام قانون کے تحت، مسلم خواتین کو بھی اپنا فوٹو شناختی کارڈ پر لگانا

چاہیے۔ یہ ویسا ہی معاملہ ہے جیسا کہ پاسپورٹ پر فوٹو لگانا، جس کو تمام علماء جائز قرار دیتے ہیں۔

14- 31-30 جنوری 2010 کو دھرم بھارتی مشن کی سالانہ کانفرنس ممبئی میں منعقد ہوئی۔ اِس موقع پر شرکاء میں 100 کاپیاں قرآن کی اور 500 سے زائد دیگر دعوتی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ اِس کانفرنس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو موجود تھے۔ لوگوں نے لٹریچر کو بہت پسند کیا۔ حمید اللہ حمید اور منظور احمد تانترے کشمیر سے اس کانفرنس میں مدعو تھے، اِس موقع پر انھوں نے لوگوں کو مطالعے کے لیے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دیگر دعوتی لٹریچر دیا۔

راج گھاٹ (نئی دہلی) میں مراری باپو (گجرات) کا ایک پروگرام 3 فروری 2010 کو ہوا۔ اِس پروگرام میں تقریباً پانچ ہزار ہندو موجود تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اپنی ٹیم کے ساتھ اس میں شرکت کی اور امن اور اسلام کے موضوع پر آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی طرف سے وہاں اسلامی لٹریچر پر مشتمل ایک اسٹال لگایا گیا۔ یہاں سے حاضرین کو دعوتی لٹریچر اور قرآن کا انگریزی ترجمہ مطالعے کے لیے بطور ہدیہ پیش کیا گیا۔ لوگوں نے اس کو نہایت شوق سے لیا۔ یہاں کئی ہندوؤں نے کہا کہ آج ہم پہلی بار قرآن کو دیکھ رہے ہیں۔

دہلی یونی ورسٹی میں 6 فروری 2010 کو ایک سمپوزیم ہوا۔ یہ سمپوزیم ایم وی کالج کی طرف سے یونی ورسٹی کے اے این باسو آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Human Unity: Inter Faith Dialogue

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اپنی ٹیم کے ساتھ اس میں شرکت کی اور انگریزی زبان میں موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی طرف سے حاضرین کو دعوتی لٹریچر اور قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

جنوری 2010 کا الرسالہ اپنی تمام تر تجلیوں کے ساتھ فردوس نظر ہوا۔ آپ کا رسالہ دنیائے صحافت کا ایک منفرد رسالہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مختار اشرف لائبریری کے قارئین ''الرسالہ'' کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں حال یہ ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا جاتا ہے، اسے تھکاوٹ کا احساس تک نہیں ہوتا۔ تقریباً 300 قارئین کی جانب سے آپ کو مبارک باد (عابر قالین آباد، مختار اشرف لائبریری، کچھوچھہ، امبیڈکر نگر، یوپی)

گڈورڈ بکس اور سی پی ایس کی طرف سے دوسرے ممالک کے علاوہ، یورپ اور امریکا کے ممالک میں مختلف مقامات پر قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر بڑے پیمانے پر بھیجا جا رہا ہے۔ حال ہی میں کینڈا کے ایک مسیحی اسکول (Hamilton School) میں قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر بھیجا گیا۔ اِس سلسلے میں اسکول کے ایک ذمے دار کا خط موصول ہوا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

I just wanted to let you know that the Qurans, DVDs and booklets have all successfully arrived at my school. After opening the package and begining to stamp the materials with school

information, the materials generated a fair bit of discissions and interest amongst my students (I teach a significant number of Muslim students) which bodes well for their use in our World Religions course. Thanks again for all of your assistance. It is greatly appreciated. (Don Bennie, Canada)

انگریزی زبان کے معروف صحافی اور مصنف خشونت سنگھ نے صدر اسلامی مرکز کے انگریزی ترجمہ قرآن کو سب سے بہتر ترجمہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے اصل الفاظ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

Maulana Wahiduddin Khan sent me two of his latest publications: A New translation of The Quran (Goodword) and The Prophet of Peace: Teachings of the Prophet Mohammed (Penguin).I have great respect for Wahiduddin Khan as a scholar of Islam who interprets his faith for the modern generation and at the same time points out follies of Mullah-minded Muslims for ever pronouncing fatwas on non-issues and calling for jihad against anyone they do not approve of. Among the many honours conferred on him was one by Virender Trehen's Foundation for Amity and National Solidarity. I have a few translations of the Quran in English including Pickthall's and Amir Ali's — the first recognised as lyrically the most readable, and the second, as the most accurate. I spent a few hours reading Wahiduddin's renderings of my favourite passages, particularly the last short suras which are in lyrical prose. All I can say is I found them more readable than any translations I had read earlier. I recommend it to Muslims and non-Muslims alike.(*Hindustan Times,* January 10, 2010, p. 18)

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
*امن عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
*انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن (مکمل)
تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت

تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
*دین وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 1983-84
ڈائری 1989-90
ڈائری 1991-92
*ڈائری 1993-94
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
*رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین وفلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
*سیرتِ رسول

شتم رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دور جدید
*عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتاب زندگی
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
*مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
*مطالعۂ حدیث
*مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
*مطالعۂ سیرت
*مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
*مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نار جہنم
نشری تقریریں
ہندستانِ آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
*ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

* نئی کتابیں

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔